www.alkalam.pk

نفاذِ شریعت

کتنا مشکل.... کتنا آسان

خاکہ و تصور، اشکالات و جوابات، اُلجھنیں اور حل

مفتی ابولبابہ شاہ منصور

المیزاب پبلکیشنز
0313-9264214
0321-2050003

کتاب...نفاذِ شریعت: کتنا مشکل....کتنا آسان
مصنف...مفتی ابولبابہ شاہ منصور
طبع اوّل...جمادی الاولیٰ 1430ھ/مئی 2009ء
تعداد...5 ہزار

اس کتابچے کی تقسیم کے خواہشمند حضرات رابطہ فرمائیں

المیزاب پبلکیشنز

0313-9264214

0321-2050003

مختصر مختصر

اُلجھنوں کا حل (پیش لفظ) 5

نظامِ شریعت کیا ہے؟ 7

استنبول سے خراسان تک 7

سادہ اور فطری نظام 8

دو لفظوں میں 10

شرعی نظام کی ایک اہم خصوصیت 11

طالبان کون ہیں؟ 13

تعبیر کا فرق 14

شرعی متبادل کی فراہمی 15

مقصد اور ضرورت کا فرق 15

دو قابلِ تحسین مثالیں 15

تربیت یافتہ نفری کیسے فراہم ہو؟ 17

تعلیم اور قضا: دو ہی شعبے 18

امانت کی ذمہ داری 19

اسلام کا مطلب کیا؟ 21

شرعی سزائیں کیوں ناگزیر ہیں؟ 22

حضرت عمر رضی اللہ عنہ والا اسلام 23

غیر منصفانہ نظام کا ردِ عمل 24

تعبیر کا فرق 25

اسلامک سوئٹزرلینڈ 26

فوجدار اور خدمت گار 27

اسلامی نظام ریاست کے دو پہلو 29

ہانڈیوالوں سے وفاداری 29

ایک فلسطینی کہاوت 30

ایمان وعقل کا امتحان 31

الٹی ہوگئی جب تدبیریں 32

لطفِ سجن اور قہرِ سجن کے بیچوں بیچ 35

عوام میں کام کے چار شعبے 36

مقبولیت کا راز 38

اسلامی ریاست کی دو ذمہ داریاں 38

شرعی سیاست خدمت کا دوسرا نام ہے 39

مختصراً وبالاختصار 42

پہلے اور بعد کا فرق 42

فوری توجہ کن چیزوں پر ہو؟ 43

آخری بات 43

نظامِ عدل معاہدے کا عکس 45

نظامِ عدل معاہدے کا ترجمہ 46

اُلجھنوں کا حل

شریعت اسلامیہ کے تصور اور اس کی عملی تطبیق کے حوالے سے ہمارے ہاں خاصی اُلجھنیں، غلط فہمیاں اور پیچیدگیاں پائی جاتی ہیں۔ روئے زمین سے اسلامی سلطنتوں کے سقوط کو چونکہ ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اور اس سو سال کے عرصے میں زمین پر کہیں اسلامی ریاست کا ماڈل موجود نہیں رہا۔ طالبان نے امارات اسلامیہ کے قیام میں کامیابی حاصل کر لی تھی لیکن ان کی یہ کامیابی مغربی استعمار کو ایک آنکھ نہ بھائی اور انہوں نے اپنے تئیں اسے ساقط کر کے ہی دم لیا۔ اس تناظر میں اپنے بھی حیران و پریشان ہیں اور غیروں کو تو موقع مل گیا ہے کہ جوانٹ شنٹ ہانکیں، جیسی غلط سلط تصویر کشی کریں، ان کو کوئی روکنے والا نہیں۔

افغانستان، چیچنیا، صومالیہ اور سوڈان میں اسلام پسند تحریکوں نے اپنی سی کوششیں جاری رکھی ہوئی ہیں۔ انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور اسلامی خلافت کے احیاء کے لیے مسلسل قربانیاں دی ہیں اور دے رہی ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ایک چیز کا مکمل عملی خاکہ سامنے نہ ہونے کی وجہ سے اس کی صورت گری میں کافی مشکلات درپیش ہیں۔ زمانے نے اس بیچ کے عرصے میں جو تیز رفتار ترقی کی ہے، دنیا کا ماحول، معاشرت اور سماجیات تبدیل کر دینے والی جو محیر العقول ایجادات سامنے آئی ہیں، ان کے تناظر میں جدید متمدن دنیا میں اسلام کی عملی تنفیذ میں حائل رکاوٹوں کا سامنا کرنا کوئی آسان بات نہیں۔

جب سے سوات میں طالبان اور حکومت کے درمیان معاہدہ ہوا ہے تب سے یہ بحث پھر زور پکڑ گئی ہے کہ کسی جگہ میں اگر اسلام کا عادلانہ نظام آ جاتا ہے تو آج کی قیامت خیز لحہ لحہ بدلتی دنیا میں اس کی عملی شکل کیا ہوگی؟ انسان کے کون سے ایسے حقوق ہیں جو اسلام اس کو واپس

دلائے گا؟ کون سی ایسی چیزیں ہیں جو غیر شرعی نظاموں نے انسانیت سے چھین لی ہیں؟ نیز یہ کہ کوئی زمینی خطہ نفاذِ اسلام کے عمل سے گزر کر معاصر دنیا کے لیے مثالی نمونہ کیسے بن سکتا ہے؟

حضرت مفتی ابولبابہ شاہ منصور صاحب معروف عالمِ دین اور صاحبِ طرز ادیب ہیں۔ انہوں نے اس موضوع پر انتشار و تشویش کے اس اعصاب شکن ماحول میں مسلسل تین کالم لکھے جو ہر طبقے میں پسند کیے گئے۔ ان تحریروں میں انہوں نے اعتدال اور توازن کو ملحوظ رکھتے ہوئے جدت پسند طبقے کے اشکالات بھی دور کیے اور طالبان کو بھی چند چیزوں کی طرف توجہ دلائی۔ ان کی اس معتدل اور متوازن تحریر سے بہت سی اُلجھنیں حل ہوئی ہیں، بہت سے اشکالات کا جواب ملتا ہے اور سوچ و فکر کے بہت سے بند دریچے کھلتے ہیں۔

افادۂ عام کے لیے ان مضامین کو کتابچے کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ مضامین میں ذیلی عنوانات لگا دیے گئے ہیں اور طباعت کی ظاہری خوبیوں کے بجائے زیادہ سے زیادہ اشاعت پر توجہ دی گئی ہے تا کہ کم خرچ میں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک بات پہنچ سکے۔ جو حضرات یہ کتابچہ تقسیم کرنا چاہیں وہ سرورق پر دیے گئے نمبر پر رابطہ کر سکتے ہیں۔

ناشر

نظامِ شریعت کیا ہے؟

استنبول سے خراسان تک:

شریعت کیا ہے؟ شرعی نظامِ عدل کا صحیح صحیح مصداق کیا ہے؟ نفاذِ شریعت سے انسانی معاشرے میں کیا تبدیلی آسکتی ہے؟ تیزی سے بدلتی ہوئی جدید دنیا میں شرعی احکام کی تنفیذ وتطبیق کی کیا شکل ہوگی؟ یہ وہ سوالات ہیں جو ہر ذہن میں گردش کررہے ہیں اور جب سے طالبان نے سوات میں حکومت کے ساتھ معاہدے کے تحت نظام عدل قائم کیا ہے، مخالفین وموافقین میں یہ بحث زور پکڑ گئی ہے۔ موافقین میں کم اور مخالفین میں زیادہ۔ جولوگ شریعت کے حامی ہیں......اورکون مسلمان ہوگا جوشریعت کا حامی نہ ہو......؟ وہ اس موضوع پر اس لیے نہیں بولتے کہ خلافت عثمانیہ کے سقوط (1924ء) کے بعد سے آج تقریباً ایک صدی ہونے کو آئی ہے کہ دنیا سے اسلامی نظام کا حاکمانہ خاکہ مٹ گیا ہے۔ اس مبارک نظام کی باقیات بھی مٹادی گئی ہیں۔ دنیا بھر کے شیطانی نظام مسلط کرنے والی قوتوں کو پسند نہ تھا کہ رحمانی نظام اپنی کسی بھی شکل میں روئے ارض پر باقی رہے لہٰذا انہوں نے کوشش کی کہ ترکی سے خلافت عثمانیہ کے سقوط کے بعد خلافت یا امارت کا شرعی نظام کہیں اور بھی قائم نہ کیا جاسکے۔ آخری عثمانی خلیفہ حجاز میں پناہ لینا چاہتے تھے۔ اگر وہ حرمین شریفین تک پہنچ جاتے تو احیائے خلافت کا امکان کسی قدر باقی رہ جاتا تھا۔ لہٰذا پوری کوشش کی گئی کہ حرمین کے ''خدام اور محافظین'' انہیں اپنے ہاں نہ آنے دیں اور اس طرح دنیا کی نظروں سے اس نظام عدل کا خاکہ بھی مٹ جائے جو انسانی حقوق کا محافظ اور انسانیت کی فلاح ونجات کا ضامن ہے۔ لہٰذا جولوگ دل سے شریعت کے حامی ہیں وہ بھی اس حوالے سے تذبذب اور ابہام کا شکار رہتے ہیں کہ نظام شریعت کا عملی

مصداق کیا ہوگا؟ اور شرعی نظام کی خاکہ گری کیونکر ہوگی؟ مثالی اسلامی ریاست کا ماڈل کس طرح کا ہوگا؟

جولوگ مخالف ہیں ان کو خدشہ ہے کہ استنبول میں ڈوبا سورج کہیں خراسان سے نہ نکل آئے۔ جہاں میں اہل ایمان کے صورتِ خورشید جینے کی ایک اور مثال قائم نہ ہوجائے۔ لہٰذا گزگز بھر کی زبانیں لٹک آئی ہیں۔ ہزلیات اور ہذیانات کا طومار باندھا جارہا ہے۔ فرضی چیزوں کو حقیقی بنایا اور حقیقت کو سات پردوں کے پیچھے چھپایا جارہا ہے۔

سادہ اور فطری نظام:

بندہ کے پاس آج سے پندرہ بیس سال قبل ایک دوست بطور مہمان آکر ٹھہرے۔ انہوں نے تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کے لیے ''مائیگریشن سٹرٹیفکیٹ'' بنانا تھا۔ بندہ ان کے ساتھ کراچی انٹرمیڈیٹ بورڈ چلا گیا۔ جس کمرے میں ہماری مطلوبہ کارروائی ہونی تھی، ہم اس کے باہر دھری بینچوں پر بیٹھے اپنی باری کا انتظار کررہے تھے۔ اس طرح کی ''انتظاری بیٹھکوں'' میں عموماً سنجیدہ گفتگو نہیں ہوتی، مگر اس دن باتوں کا رخ اچانک اسلامی نظام کی طرف پھر گیا۔ اس کا سبب جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ ہوا کہ ہم انتظار کی شدید کوفت برداشت کررہے تھے۔ سرد مہری اور اجنبیت سے بھرپور ناگوار رویّے جھیل رہے تھے۔ جبکہ کچھ ''آنے جانے'' والوں کا کام بہت سہولت سے ہورہا تھا۔ اس اجنبیت اور عدم توجہ کے ماحول میں ہر پاکستانی فطری طور پر اس دن کو یاد کرتا ہے جب اُس نے یا اس کے بڑوں نے اِس جذبے کے تحت پاکستان بنانے کے لیے قربانیاں دی تھیں کہ یہاں انصاف ہوگا۔ مساوات ہوگی۔ ہر حق دار کو اس کا حق ملے گا۔ طبقاتی استحصال کرنے والے عناصر محبِّ وطن قوتوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیں گے۔

ہم نے بھی فطری طور پر ان نعروں کو یاد کیا جو ہمارے آباواجداد نے تحریک پاکستان کے لیے قربانیاں دیتے وقت لگائے تھے۔ پھر اپنی اس حالت زار کو دیکھا جو آہنی بینچوں پر پہلو بدلتے بدلتے کافی پتلی ہوچکی تھی۔ چونکہ مزاج شکوے شکایات کا نہ تھا اس لیے باتوں کا رخ

اس طرف مڑ گیا کہ اگر بالفرض پاکستان بنتے ہی یہاں شریعت ہوتی تو اس کی کیا صورت ہوتی؟ اور بالفرض آج اگر شرعی نظام کم از کم اس تعلیمی ادارے میں ہو تو کیسے ہو؟ میرے دوست کا کہنا تھا:

’’شاہ صاحب! بہت مشکل ہے آج کے دور میں شریعت کا عملی نفاذ۔ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ تعلیمی اداروں تک میں ایسی گھمبیر صورت حال ہے کہ صبح سے آپ رولر چلتا دیکھ رہے ہیں۔ یہاں بیٹھنے سے اکتائی آرہی ہے۔‘‘

بندہ نے عرض کیا: ’’انفرادی اور اجتماعی زندگی میں شریعت کا مفہوم و مصداق کیا ہے؟ یہ سمجھ لیا جائے تو کسی قسم کا ابہام یا تشویش باقی نہیں رہتی۔‘‘

’’مثلاً: آپ بتائیے کہ اس ادارے میں نفاذِ شریعت کس طرح ہو سکتی ہے؟‘‘ میرے دوست براہِ راست سوال کر گئے۔

’’بہت آسان ہے بہت آسان! شریعت چونکہ فطرت کی تکمیل اور ترجمانی کرتی ہے اس لیے تمام فطری چیزوں کی طرح اس کا اپنانا بھی بہت ہی آسان ہے۔‘‘

’’شاہ صاحب! آپ رجائیت پسند ہیں۔‘‘

’’ویسے تو شریعت کے حوالے سے رجائیت پسند ہونا بھی کوئی بری بات نہیں، لیکن میں بالکل سادہ اور فطری بات کہتا ہوں۔ اس ادارے میں شریعت کی حکمرانی کا مطلب بہت آسان ہے۔ شریعت ہر انسان سے اس کی استطاعت کے مطابق معاشرے میں صالح کردار چاہتی ہے لہٰذا اس ادارے کی حدود میں ’’شرعی قانون‘‘ یہ ہوگا کہ ہر شخص صبح وقت پر ڈیوٹی پر پہنچے۔ دن بھر اپنا کام دیانت داری اور لگن سے کرے۔ ظلم کرے نہ ہی ظلم ہونے دے۔ میرٹ اور انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ آنے والوں کو مناسب سہولتیں اور بروقت راہنمائی فراہم کی جائے۔ عوام جب دیکھیں گے کہ ’’اسلامی ریاست‘‘ کا سرکاری عملہ محنت اور دیانت سے کام کر رہا ہے تو انہیں جو انتظار کی کوفت یا اصولوں پر عمل کے دوران جس سختی سے گزرنا ہوگا،

وہ اسے ہنسی خوشی برداشت کریں گے۔ سرکاری عملہ عوام کے لیے اور عوام سرکاری ملازمین کے لیے اچھے جذبات لے کر آئیں گے اور دُعائیں دیتے رخصت ہوں گے۔‘‘

دو لفظوں میں:

اس دن کی گفتگو میرے دوست کی اس خوشگوار حیرت پر ختم ہوگئی۔ ’’شریعت اتنی آسان ہے۔ ہمیں تو کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔‘‘ ممکن ہے کچھ قارئین کو یہ سہل پسندی لگے لیکن میں آپ کو اس کی ایک اور مثال دیتا ہوں۔ عام پولیس والوں سے ہر پاکستانی شاکی رہتا ہے لیکن موٹر وے والوں کی نہ صرف عزت کرتا ہے بلکہ بھاری جرمانہ بھی بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ بھرتا ہے۔ کیوں؟ خود مجھے جب موٹر وے والوں نے رسید دکھائی کہ ابھی پچھلا جرمانہ فلاں ایم این اے کا ہوا ہے اور بندہ نے اپنی آنکھوں سے یہ رسید دیکھی تو اپنے ساتھی کو کسی طرح کی حیل وحجت کے بغیر حکم دیا کہ پوری رقم بھرو۔ پھر ہم پولیس آفیسر سے گرم جوش مصافحہ کر کے دیانت پر اسی طرح قائم رہنے کی تاکید کر کے خوش خوش رخصت ہوگئے۔

تو جناب شریعت کا نفاذ بہت آسان ہے۔ دو لفظوں میں آپ پورے ریاستی نظام کی ’’اسلامائزیشن‘‘ کر سکتے ہیں۔ وہ دو لفظ ہیں: ایمان داری اور انصاف۔ عوام میں سے ہر شخص اپنا کام ایمان داری سے کرے اور حکومت کا ہر شعبہ عوام کو پورے خلوص کے ساتھ انصاف فراہم کرے۔ اتنی سی بات ہے جس کے لیے ہم ساٹھ سال سے خوار ہو رہے ہیں اور بات بن کے نہیں دے رہی۔ ہمارے حکمرانوں نے عوام کو بے ایمانی سکھائی۔ ایمان دار کی تحقیر اور بے ایمان کی توقیر کی، لہٰذا ہم من حیث القوم بدعنوان ہوگئے۔ پھر جب ہم بے ایماں ہوگئے تو ہم نے بھی ظالم حکمران منتخب کیے کیونکہ وہی ہماری بے ایمانی کی لت پوری کروا سکتے تھے۔ انہوں نے منتخب ہو کر جی بھر کے ظلم کیا اور ظلم کرنا سکھایا۔ اس طرح بے ایمانی کی چکی اور ظلم کا رہٹ چلتا رہا۔ عوام بے ایمانی کی چکی میں پستے رہے اور حکمران ظلم کے رہٹ سے مفادات کے ڈول بھر بھر کے اپنی آخرت اور ہماری دنیا برباد کرتے رہے۔

شرعی نظام کی ایک اہم خصوصیت:

شرعی نظام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس پر عمل کرنے سے سب سے پہلے معاشرے کے دو اہم مسائل حل ہوتے ہیں: روزگار اور امن۔ ایمان داری سے ''رزق'' ملتا ہے اور انصاف سے ''امن'' قائم ہوتا ہے۔ یہ خدا کا آفاقی وعدہ ہے۔ یہ خدا کا تکوینی قانون ہے۔ جس علاقے کے عوام میں دیانت ہوگی، وہاں روزی روزگار وافر ہوگا۔ جہاں کے حکمران انصاف کریں گے، وہاں امن وامان عام ہوگا۔ اس میں مسلم وغیر مسلم کی تفریق نہیں۔ اس میں خدا کے تکوینی وغیر تکوینی قانون کا فرق ہے۔ یہ تشریعی وغیر تشریعی نظام کا لازمی نتیجہ ہے۔ غیر مسلم بھی شریعت کے اس حصے کو اپنائے گا تو ترقی یافتہ اور پُرامن ہوگا۔ مسلم بھی اگر بے ایمان اور بے انصاف ہوں گے تو پسماندہ اور بدحال ہوں گے۔

طالبان کون ہیں؟

لوگ کہتے ہیں شریعت مشکل ہے۔ خدا کی قسم! وہ شریعت کا مفہوم نہیں سمجھتے۔ انہیں بدقسمتی سے ہم جیسے مہربان ملے ہیں جو شریعت کی آسان تعبیر اور درست ترجمانی نہیں کر سکتے۔ سیدھی سی بات ہے آپ عوام سے کہہ دیں: آج سے تمہیں دو روپے کی روٹی اور دس روپے کی دوائی کی پرچی ملے گی۔ تمہارا غم ہمارا غم ہوگا اور ہمارے پاس موجودہ وسائل میں تمہارا برابر حصہ ہوگا۔ تم کل سے ایمان داری کی قسم کھا کر نیا دن شروع کرو۔ اسی طرح آپ سرکاری عملے سے کہہ دیں کہ کلرک اور کانسٹیبل کی تنخواہ پندرہ ہزار روپے ہے۔ کل سے جس نے رشوت لی اسے اس کے دفتر کے سامنے چوک میں کھڑا کر دیا جائے گا کہ اللہ سے معافی مانگے اور اس کے بندوں کا پیسہ واپس کرے، ورنہ یہیں کھڑا دھوپ تاپتا رہے۔ بس اتنی سی تو بات ہے۔ یہی تو شریعت کا خلاصہ ہے۔ عوام کی طرف سے معاملات کی درستی اور حکمرانوں کی طرف سے فرائض کی ادائیگی۔ دو جملوں میں بات سدھر سکتی ہے۔ دو لفظی قانون سے اسلام آ سکتا ہے۔ دو منٹ میں غیر شرعی نظام پر دو حرف بھیجے جا سکتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ خلافت عثمانیہ کا ماڈل ٹوٹنے کے

بعد ہم پر ایسا طبقہ مسلط ہوگیا ہے جو نہ شریعت چاہتا ہے اور نہ انسانیت کا قائل ہے۔ وہ نہ اسلام چاہتا ہے نہ پاکستان۔ دیانت چاہتا ہے نہ انصاف۔ وہ خود خواہشات کا غلام ہے لیکن ہم پر بادشاہ بن گیا ہے۔ اسے مذہب اور وطن سے کوئی سروکار نہیں اس لیے نہ وہ مذہب کو باقی چھوڑنا چاہتا ہے نہ وہ ہمارے وطن سے مخلص ہے۔ طالبان کسی فرقے کا نام نہیں، وہ ان اصلاح پسند اور محبِّ وطن قوتوں کا نام ہے جو پاکستان کی طبقاتی تفریق سے تنگ آ گئے ہیں۔ طالبان ہر اس شخص کا نام ہے جو فرسودہ طبقاتی نظام سے غیر مطمئن ہے اور معاشرے کے پسے ہوئے پسماندہ لوگوں کو ان کے حقوق دلوانا چاہتا ہے۔ وہ قیام پاکستان کے مقاصد کی تکمیل کے لیے ایمان داری اور انصاف چاہتے ہیں۔ ایک امریکی اخبار کے حوالے سے روزنامہ جنگ، مؤرخہ 18/ اپریل 2009ء میں شائع ہونے والی رپورٹ پڑھیے:

''پاکستان کے سرکاری حکام اور مبصرین کا کہنا ہے ملک میں گہرائی تک اثر ورسوخ حاصل کرنے کے لیے طالبان طبقاتی نظام ختم کر رہے ہیں اور امیر زمینداروں اور بے زمین ہاریوں میں پائی جانے والی خلیج سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ اسی حکمت عملی نے سوات میں طالبان کے لیے حکمرانی کی راہ ہموار کی جہاں حکومت نے رواں ہفتے شرعی قوانین نافذ کیے۔ سرکاری عہدیداروں اور مبصرین کا کہنا ہے کہ 1947ء میں آزادی کے حصول کے بعد، بھارت کے برعکس پاکستان میں بالائی طبقے نے ملک کے وسیع ذخائر کا کنٹرول سنبھال لیا جبکہ مزدور طبقہ ان کی خواہشات کا غلام ہوگیا۔ یکے بعد دیگرے آنے والی حکومتیں زرعی اصلاحات کے ساتھ تعلیم اور صحت کے شعبوں میں بھی بہتری لانے میں ناکام ہوگئیں۔ دیہی علاقوں میں رہنے والے غریب طبقے کے لیے ترقی کے راستے بالکل نہیں ہیں۔ پاکستانی نژاد امریکی وکیل اور امریکی صدر بارک اوباما کے تعلیمی دنوں کے ساتھی محبوب محمود نے کہا ہے پاکستان کے عوام ذہنی طور پر انقلاب کے لیے تیار ہو چکے ہیں۔ مختلف طبقات کے درمیان خلیج جو پاکستان میں گہرائی تک پھیلی ہوئی ہے، کا فائدہ طالبان اُٹھا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ طالبان موسیقی اور اسکولوں پر محض پابندیاں عائد

کرنے سے بھی زیادہ کا ارادہ ظاہر کررہے ہیں۔ وہ اسلامی قوانین، مؤثر حکومت اور معاشی وسائل کی ازسرنوتقسیم کا وعدہ بھی کررہے ہیں۔''

اگرچہ اس رپورٹ کے دیگر حصوں میں طالبان تحریک پر منفی تبصرے کیے گئے ہیں لیکن غور کیا جائے تو اس سے جہاں طالبان تحریک کے وجود میں آنے کے اسباب اور اس کی کامیابی کی وجوہات کی نشاندہی ہوتی ہے، وہیں اس سے طالبان کے لیے اپنی کامیابی کو برقرار رکھنے کا لائحہ عمل بھی سامنے آجاتا ہے۔ موقع سے استفادہ کرتے ہوئے ہم طالبان کی خدمت میں تین گزارشات پیش کرنا چاہیں گے:

تعبیر کا فرق:

(1) پہلی بات یہ ہے کہ طالبان اپنی ترجمانی کے معیار کو بہتر بنائیں۔ مثلاً: دیکھیے طالبان نے جن چیزوں کے خلاف آواز اُٹھائی، وہ چیزیں بذاتِ خود پاکستان کے قانون کی رُو سے غلط تھیں۔ ان کے خلاف آواز اُٹھانا پاکستان کی آئین کی تکمیل ہے نہ کہ خلاف ورزی۔ بعض چیزیں اقوام متحدہ کے چارٹر سے بھی مطابقت رکھتی تھیں۔ مثلاً: آپ کسی کی مرضی کے خلاف اس پر کوئی نیا نظام نہیں ٹھونس سکتے۔ کسی سے وعدہ کرکے نہیں مُکر سکتے۔ قبائلی عوام شریعت کے خلاف کسی نظام کو نہیں مانتے۔ ان پر یہ نظام کیوں مسلط ہے؟ ان سے انگریز کے زمانے سے وعدہ کیا گیا تھا کہ 1994ء کے بعد وہ اپنی مرضی سے یہاں کا نظام بنا سکیں گے۔ 1994ء میں جب انہوں نے اس وعدے کی تکمیل چاہی تو وہ شاہراہ خون میں نہلا دی گئی جہاں اس وعدے کی تکمیل کے لیے چند نوجوان مظاہرہ کررہے تھے۔ بندہ نے سرحد کے ایک سفر کے دوران بونیر کے قریب ایک سڑک کے کنارے وہ جگہ خود دیکھی جہاں شریعت چاہنے والوں کو شہید کیا گیا تھا۔ منشیات فروشی، نوجوان نسل کو صحت مند سرگرمیوں سے ہٹ کر فحاشی کی لت لگانا، رشوت خوری، چور بازاری، ملاوٹ فروشی، بدعنوانی...... یہ سب کچھ پاکستان کے قانون کے خلاف ہے۔ پاکستان کا ہر شہری اپنے اس ملکی قانون کا نفاذ چاہتا ہے۔ طالبان اسی خواہش کو عملی

شکل دے رہے ہیں......لیکن شہری عوام میں ان کی حمایت کیوں نہیں؟ مناسب تعبیر اور جاندار ترجمانی نہ ہونے کی وجہ سے۔ صحافت اور سفارت کے میدان کی باریکیاں ملحوظ نہ ہونے کی وجہ سے۔ طالبان جب کوئی کام کریں تو اس کے اظہار کے لیے کچھ ایسے سفارتی الفاظ منتخب کریں جو آئین پاکستان کے تحت ان کی سرگرمیوں کی تشریح کرسکیں۔ انہیں ایسے فرد یا ادارے کی ضرورت ہے جو غازی عبدالرشید شہید رحمہ اللہ کی طرح ان کے مطالبے کی حقیقت اور حقانیت آئین کی رو سے منوا سکے۔ صحافیوں کے سامنے اپنا موقف اس انداز میں پیش کرے کہ پاکستان کا ہر انصاف پسند شہری اسے اپنے دل کی آواز سمجھے۔

شرعی متبادل کی فراہمی:

شریعت کی آسان تشریح کی ایک مثال اوپر دی جا چکی ہے۔ ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے۔ جب فحاشی پر پابندی لگائی گئی تو ضروری تھا کہ نکاح کا نظام مسنون بنیادوں پر جاری کیا جائے۔ شریعت جب کسی چیز سے منع کرتی ہے تو اس کا متبادل بھی پیش کرتی ہے۔ پختون معاشرے میں شادی کے حوالے سے بہت سی ایسی رسومات ہیں جو شادی کو مشکل ترین بنادیتی ہیں۔ طالبان نے فحش سی ڈیز، موسیقی اور بے پردگی وغیرہ پر پابندی لگائی تو ساتھ میں نکاح مسنون کی عوام کو ترغیب دی۔ مسنون نکاح وہ ہے جو آسان ہو اور کم خرچ ہو۔ اس میں نہ فضول رسومات ہوں اور نہ بھاری بھرکم خرچ۔ اس کے لیے انہوں نے ''شعبۂ عروسات'' قائم کیا۔ جو شخص کہیں رشتہ بھیج چکا ہے یا بھیجنا چاہتا ہے اور اس سے غیرشرعی رسومات پوری کرنے کا مطالبہ کیا جارہا ہے، اسے چاہیے کہ وہ اس کی اطلاع اس شعبے کو دے۔ طالبان اس کی شکایت دور کرکے نکاح کو ویسے آسان بنائیں گے جیسے وزیراعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف نے شادیوں میں ون ڈش کی شرط لگا کر غریب والدین کے خرچے کم کروائے۔ میاں صاحب کی تعریف تمام پاکستان نے کی......لیکن طالبان کی بات کو اخبارات نے اس انداز میں لیا کہ طالبان کی سوچ میں تضاد ہے۔ کل وہ پسند کی شادیوں پر سزا دے رہے تھے اور آج وہ پسند کی شادیوں کو رواج

دے رہے ہیں۔ دیکھا آپ نے! بات کیا تھی اور کہاں پہنچا دی گئی؟ اس لیے سب سے پہلی اور فوری ضرورت میڈیا سے براہِ راست رابطے اور اپنے عوامی وفلاحی خدمات کی صحیح تعبیر اور اپنے موقف کی درست تفہیم کا ہے۔ آدھی سے زیادہ مشکلات اور نصف سے زیادہ اعتراضات خود بخود ختم ہو جائیں گے۔

مقصد اور ضرورت کا فرق:

(2) دوسری بات یہ ہے کہ شریعت کا خلاصہ نکالا جائے تو وہ تین عنوانات میں سمٹ جاتا ہے: (1) عبادات (2) معاملات (3) عقوبات......عبادات کا مطلب ہے حقوق اللہ کہ انسان اللہ کا حق صحیح صحیح ادا کرے۔ معاملات کا مطلب ہے حقوق العباد یعنی بندوں کا حق ٹھیک ٹھیک پورا کیا جائے۔ عقوبات کا مطلب ہے سزا، یعنی جونکما شخص ان دو قسم کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرے اور سمجھانے سے بھی نہ مانے تو اس کو آخری چارہ کار کے طور پر ناگزیر سزا دی جائے۔ عقوبات یعنی سزائیں شریعت کا مقصود نہیں۔ ان کو تو کم از کم جاری کرنے اور زیادہ سے زیادہ ستر پوشی پر زور دیا گیا ہے۔ مقصد تو اللہ اور اس کے بندوں کا حق ادا کرنا ہے۔ یہی شریعت کا مقصدِ اصلی ہے۔ سزا تو درجۂ ضرورت میں ہے۔ جب بات یوں ہی ہے تو پھر شرعی نظام کی علامت سزاؤں کا نفاذ نہ ہونا چاہیے بلکہ اس کی علامت عبادات کے لیے دی گئی ترغیبات اور سہولتوں کی تشہیر ہونی چاہیے۔ عوام کے حقوق کی ادائیگی کا زوردار تذکرہ اور تذکرے سے زیادہ بھرپور عمل ہونا چاہیے۔ جب عوام کے سامنے اسلام کا فلاحی پہلو آئے گا۔ انہیں اپنے مسائل حل ہوتے نظر آئیں گے۔ بدعنوانی اور ناانصافی کا خاتمہ ہوگا۔ ہر حق دار کو اس کا حق ملے گا تو وہ خود بخود اس نامراد شخص کو سزا دینے کا مطالبہ کریں گے جو اس بابرکت نظام کی خلاف ورزی کر کے ان کے لیے مسائل پیدا کر رہا ہے۔

دو قابلِ تحسین مثالیں:

آج کل عوام کے ذہن کچھ یوں بن گئے ہیں کہ شرعی نظام کا نام سنتے ہی حدود کا تصور

ذہن میں آجاتا ہے۔ حدود تو آخری، تیسرے اور ناگزیر مرحلے میں ہیں۔ شریعت کی تعبیر تو حقوق اللہ وحقوق العباد کے قیام سے ہونی چاہیے۔ شریعت کا لفظ سن کر اللہ سے محبت اور بندوں کی خدمت کا تصور آنا چاہیے۔ دنیا وآخرت کی بھلائیوں اور جسمانی وقلبی راحت واطمینان کا لطف انگیز خیال دل پہ چھا جانا چاہیے۔ مغرب زدہ میڈیا نے نہایت عیاری سے شریعت مطہرہ کو بہت سخت اور مشکل......اور اپنے انسانیت کش نظام کو بہت آسان اور پسندیدہ بنا دیا ہے۔ اس خطرناک پروپیگنڈہ کے توڑ کی فوری ضرورت ہے۔ وہ اسی صورت ممکن ہے جب طالبان کا تعارف عوام کے خادم کی حیثیت سے ہو۔ فلاح عامہ کے سرگرم کارکن کی حیثیت سے ہو۔ اسلام انسان کو جو کچھ دیتا ہے: رزق، امن، خوشحالی، تمام انسانی حقوق......اس کو پہلے سامنے لایا جائے اور پھر اسلام بدرجۂ مجبوری جو سزا انسان کو دیتا ہے وہ ہماری ترجیحات کے بالکل آخر میں ہو۔ یہ تمام سزائیں برحق ہیں اور ان کے بغیر کسی انسانی معاشرے سے جرائم ختم نہیں ہوسکتے، لیکن یہ بات دنیا کو سمجھانے سے پہلے یہ بتانا چاہیے کہ اسلام نے انسان کو فلاح وخوشحالی کی جو جو صورت دی ہے، وہ دنیا کا کوئی نظام نہیں دے سکتا۔ اس حوالے سے ہمیں حزب اللہ تو نہیں، حماس کی مثال سامنے رکھنی چاہیے۔ انہوں نے اپنے عوام کی جو تربیت کی ہے اور جس طرح انہیں اپنے ساتھ ملایا ہے، اس طرزِ محنت کا مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ فلسطینی عوام ہر طرح کے اسرائیلی مظالم سہہ لیتے ہیں، غزہ کے کھلے قیدخانے، زندہ قبرستان میں رہنے پر تیار ہوجاتے ہیں، مگر حماس کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ حماس کی قیادت نے انہیں باور کروا دیا ہے کہ ان کی دنیوی ترقی وفلاح صرف اور صرف اسلام سے چمٹے رہنے میں ہے۔ اسلام ہی ان کے دکھوں کا اکلوتا مداوا ہے۔ فلسطین کے بعد آپ ترکی چلے جائیے۔ وہاں کی اسلام پسند پارٹی نے اپنے نام میں اسلام کا لفظ نہیں لگایا، لیکن اسلام کا نام لیے بغیر اسلام کا خلاصہ سمو دیا ہے۔ ''ترقی اور انصاف پارٹی۔'' اس نے ان دو لفظوں میں اسلامی نظام کا خلاصہ سمیٹ لیا ہے۔ اسلام سے زیادہ انسانیت کی ظاہری وباطنی، روحانی ومادی ترقی کون چاہے گا؟

اسلام سے زیادہ حقیقی اور دوٹوک انصاف کون فراہم کرسکتا ہے؟ لہٰذا اسلامی پارٹی یا طالبان حکومت کا موٹو ہونا چاہیے: ہر میدان میں ترقی اور ہر قیمت پر انصاف۔ سماجی انصاف، معاشی انصاف، معاشرتی انصاف۔ اب اگر یہ پارٹی ناکام ہو تو اسلام کے نام پر حرف نہیں آئے گا۔ اگر کامیاب ہو تو اسلام پسند خطرہ مول لیے بغیر میدان مار جائیں گے۔ یہ کتنا خوب صورت اسٹائل ہے؟ کام بھی ہو جائے اور کوئی بلاضرورت چوکنا ہو کر ہمارا راستہ بھی نہ کاٹے۔ ایسے حکمت بھرے انداز تو مؤمن کا گمشدہ سرمایہ ہیں۔

تربیت یافتہ نفری کیسے فراہم ہو؟

تیسرا مسئلہ تربیت یافتہ نفری کا ہے۔ عوام کے سامنے تو وہی افراد اور ان کی کارکردگی ہوتی ہے جو کسی چیز کی تنفیذ کے وقت ان کے ساتھ بات چیت کرتے، کچھ کہتے سنتے یا حکم دیتے اور منع کرتے ہیں۔ ان کا تربیت یافتہ، مہذب و بااخلاق اور مختلف شعبہ ہائے زندگی کو سمجھنے والا ہونا ضروری ہے۔ ایسی نفری فوری طور پر کہاں سے آئے گی؟ اس کا حل ہمیں انگریز کے طرزِ سیاست کا مطالعہ کرنے سے ملتا ہے۔ خوبی کی چیز جہاں ملے، مومن کا گمشدہ سرمایہ ہے۔ انگریز نے اپنے ایک اصول کی بنا پر قلیل تعداد میں ہوتے ہوئے بھی برصغیر میں بڑی کامیاب حکومت کی۔ وہ کرتا یہ تھا کہ صوبے میں ایک اپنا گورنر، ایک آئی جی اور ایک کمشنر رکھتا تھا۔ بس یہی دو تین افراد۔ بسا اوقات ڈپٹی کمشنر تک دیسی ہوتے تھے۔ نظام وہ دیتا تھا، قانون اس کا ہوتا تھا اور اس پر آگے عمل کروانے کے پابند علاقے کے نواب، وڈیرے، خان بہادر، ٹوڈی صاحبان اور مقامی آبادی سے لیے گئے افراد ہوتے تھے جو یہاں کے مزاج کو جانتے اور مقامی عوام سے نمٹنے کا تجربہ رکھتے تھے۔ میں انگریز کی اس چیز کو مثال نہیں بنا رہا، مطلقاً عقل وحکمت کی بات کر رہا ہوں۔ انگریز سارے سردرد سے فارغ ہو کر ملکۂ برطانیہ کا تاج بڑی خوبی سے سربلند رکھتا تھا۔ طالبان کو تنفیذ احکام کا عمل خود کرنے کے بجائے متعلقہ محکمے اور اس کے عملے سے کروانا چاہیے۔ عملہ درست کام کرے گا تو واہ واہ طالبان کی ہوگی۔ غلطی کرے گا تو لوگ اسی سے متنفر ہوں گے۔

طالبان کی نیک نامی پر حرف نہ آئے گا۔ طالبان تعلیم اور قضا اپنے ہاتھ میں رکھیں بقیہ کام متعلقہ لوگوں سے لیں۔ نفری کی کمی کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے جو کوتاہیاں ہو جاتی ہیں، ان کی شکایت بھی کوئی نہ کرے گا۔

تعلیم اور قضا دو ہی شعبے:

کچھ لوگ یہی مشورہ اس انداز میں دیں گے: ''طالبان کو قانون ہاتھ میں نہ لینا چاہیے۔'' بندہ اس بات کو یوں کہے گا کہ طالبان قانون اپنے ہاتھ میں رکھیں، (پیچھے کہا جا چکا ہے: تعلیم اور قضا صرف دو شعبے اپنے ہاتھ میں رکھیں۔ بس!) اس کی تنفیذ اپنے ہاتھ میں نہ لیں۔ اس کے لیے متعلقہ محکمے اور عملے سے کام لیں۔ انگریز ٹارگٹ دیتا تھا۔ نظام وضع کرتا تھا۔ اس پر عمل کروانے کی ذمہ داری مقامی افراد کو سونپ دیتا تھا۔ اگر وہ غلطی کرتے تو رسوائی انہی کی ہوتی تھی۔ کارکردگی دکھاتے تو واہ واہ انگریز اور اس کے نظام کی ہوتی تھی۔ طالبان کے محتسب کو سڑک پر نہ آنا چاہیے۔ سڑک پر صرف ان کا نرم مزاج مبلغ یا پھر خادم مزاج کارکن عوام کو دکھائی دینا چاہیے۔ اسلام میں حاکم وہ ہے جو قوم کا خادم ہو۔ عوامی خدمت، فلاحی خدمت، رفاہی خدمت، مریض کو ہسپتال پہنچانا، بوڑھے کو سڑک پار کرانا، دیہاتوں میں مسجدیں اور سڑکیں بنانا، شہروں میں نظمِ عامہ کو بحال وفعّال رکھنا، عوامی سہولتوں کی ہر چیز کو عوام کی دہلیز تک پہنچانا۔ طالبان کارکن یہ کام کرتے عالمی منظرنامے پر دکھائی دیں۔ کلاشن اور کوڑے کے ساتھ ان کی مسلسل تصویروں کا چھپنا، ان کی فلاحی خدمات کو دنیا سے چھپا رہا ہے۔ کام وہ کرنا چاہیے جس میں نفع ہو اور ضرر نہ ہو۔ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ طالبان کی لاٹھی تو ویسے بھی بہت قیمتی ہے اور ان کا دشمن ویسے بھی سانپ سے زیادہ زہریلا ہے۔ انہیں تو اس اصول کی پاسداری نہایت اہتمام اور احتیاط سے کرنی چاہیے۔ وما علینا الا البلاغ.

امانت کی ذمہ داری

پچھلے کالم میں چند سادہ سی گزارشات تھیں۔ آج کے کالم میں چند واقعات ہیں۔ ان واقعات کی روشنی میں چند ''باواقعہ گزارشات'' ہیں۔ یہ واقعات بالکل سچے ہیں اور براہِ راست بندہ کے ساتھ یا اس کے سامنے پیش آئے ہیں۔ زندگی چونکہ نام ہی مشاہدات اور تجربات کا ہے اس لیے یہ بندہ کے حافظے میں نقش ہو کر رہ گئے تھے۔ یہ عاجز سمجھتا ہے کہ ان کے اظہار کا آج سے اچھا کوئی موقع نہیں۔

(1) بچپن میں ہمارے محلے میں ایک خاتون ہوتی تھیں۔ ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ چھوٹے چھوٹے بچے تھے جن کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ ایک صاحب حیثیت شخص نے پیش کش کی کہ وہ ان کے گھر کے کام کاج نمٹا دیا کرے۔ وہ اس کو معقول معاوضہ دیں گے۔ اماں جی نے پیش کش سنتے ہی انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کل میرے رشتہ دار میری بچیوں کا رشتہ لینے نہیں آئیں گے کہ ان کی ماں گھروں پر کام کرتی تھی۔ اگر ترس کھا کر رشتہ لے بھی گئے تو ساری عمر بچیوں کو طعنہ ملے گا کہ تمہاری ماں لوگوں کے برتن کپڑے دھوتی تھی۔ آج تمہیں نخرے آ رہے ہیں؟ دنیا بہت ظالم ہے۔ میں اپنی بچیوں کے لیے اپنے پیچھے یہ طعنے اور ملامت چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ بندہ کو آج تک یاد ہے کہ ایک غریب، مفلوک الحال خاتون جس کا بظاہر کوئی سہارا نہیں، ہر طرح کی مشقت جھیلنے پر تیار ہے، مگر ایسا کام کرنے سے قطعاً انکاری ہے جو اس کے بچوں کے لیے عار کا سبب بنے۔

سوات میں جب طالبان کو نظامِ عدل قائم کرنے کا موقع مل گیا تو اب انہیں چاہیے اپنے پیچھے شاندار تاریخ چھوڑ کر جائیں۔ مزا تو تب ہے جب انسان اپنی تعریف خود نہ کرے، نہ

اس کے حامیوں کو اس کی خوبیاں جمع کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کرنی پڑے، دنیا خود ہی اس کے قصیدے پڑھے۔ آدمی کو اپنے دشمنوں سے اتنا نہیں ڈرنا چاہیے جتنا دوستوں سے۔ دشمنوں کی دشمنی کا علاج آسان ہوتا ہے۔ دوست ''دوستی'' پر اُتر آئے تو اسے نمٹنا مشکل ہوتا ہے۔ طالبان کے دشمنوں کو دنیا کے ذہین ترین تھنک ٹینک کی معاونت، دنیا کے مالدار ترین سرمایہ داروں کا خطیر سرمایہ اور ماہر ترین پروپیگنڈا سازوں کا طویل تجربہ حاصل ہے۔ ان کے دوست کچھ تو نادان ہیں اور کچھ ڈیڑھ ہوشیار۔ کچھ کے روزی روزگار کا مسئلہ ہے کہ ان کی روٹی ہی اسلام پسندوں کی مخالفت سے وابستہ ہے اور کچھ کے پیٹ میں سدا سے مروڑ رہتے ہیں۔ نادانوں کا مسئلہ ہوشیاروں سے بڑھ کر اور ہوشیاروں کی کوششیں بیگانوں سے زیادہ فتنہ خیز ہیں۔ لازم ہے کہ ہر قدم پھونک پھونک کر اُٹھایا جائے۔ دنیا میں بہادر سے بہادر آدمی بھی عقل مند نہیں کہلائے گا اگر وہ اپنے حمایتیوں اور ہمنواؤں میں کمی اور مخالفین میں اضافے پر تشویش نہ کرے۔ اگر کسی عورت پر چند بچوں کی ذمہ داری ہے اور وہ فقر وفاقے میں مبتلا ہونے کے باوجود ایسا جائز کام بھی نہیں کرتی جس کی تنخواہ حلال ہے لیکن اس کی بنا پر اس کی بچیوں کے مستقبل کو ''ہمدرد رشتہ داروں'' کے غیر منصفانہ تبصروں کا خطرہ ہے تو طالبان پر تو دین اسلام کی تمثیل وتعبیر کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ انہیں تو وہ مباحات (جائز کام) بھی نہ کرنے چاہییں جو فی الواقع درست ہوں لیکن ان کی وجہ سے دنیا کے طول وعرض میں بسنے والے اسلام پسندوں کو ملامت آمیز باتیں سننے یا حقارت آمیز نظروں سے دیکھے جانے کا اندیشہ ہو۔ اگر بالفرض کوئی ان کی صحیح بات کو غلط رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کرے تو اس کی صفائی کی ذمہ داری بھی طالبان کو ہی پوری غیرت کے ساتھ سنبھالنی چاہیے۔ دنیا بھر کے اسلام پسندوں نے ان کی حمایت کر کے اپنے آپ کو زہریلے تیروں کے ترکش کے سامنے لاکھڑا کیا ہے۔ ان تیروں سے بچاؤ کا سامان فراہم کرنا طالبان کی دینی واخلاقی غیرت کا تقاضا ہے۔ وہ اگر عام میڈیا پر نہیں آتے تو نہ سہی، لیکن اپنے خیرخواہوں کی تشفی کے لیے ان کو اپنے اقدامات کی حقیقت اور ان کے جواب سے مطلع کرنا اور انہیں قائل ومطمئن

کرنا ان کی دینی واخروی ذمہ داری ہے۔ انہیں یہ ذمہ داری خوش دلی سے نبھانے کا انتظام کرنا چاہیے۔ اگر وہ اپنے ہم خیال وہم نظریہ لوگوں کو کسی چیز کا قائل نہ کرسکیں تو ان کی بات مان لینا یا کم ازکم اپنے کچھ اقدامات کو موقوف یا مؤخر کردینا بھی شریعت واخلاق کا تقاضا ہے۔

اسلام کا مطلب کیا؟

(2) سندھ کی مشہور علمی وروحانی شخصیت حضرت مولانا تاج محمود امروٹی رحمہ اللہ تعالیٰ کے پوتے ایک مرتبہ کراچی تشریف لائے تو بندہ کی ان سے ملاقات ونشست رہی۔ رخصت ہوتے وقت انہوں نے سندھ کی روایت کے مطابق بندہ کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ بندہ نے عرض کی کہ یہ عاجز خود بھی آپ کی طرف آنا چاہتا تھا اور اس کا مقصد کچھ اور نہیں دین سے منسوب سندھ کی ایک مشہور شخصیت سے ملاقات اور انہیں دین کی دعوت دینا ہے۔ یہ صاحب سادات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر میری اور آپ کی برادری کا ایک فرد (اتفاق سے اس وقت متکلم اور سامع دونوں سادات برادری سے تعلق رکھتے تھے) مکمل طور پر دین پر آجائے تو کیا ہی اچھی بات ہوگی؟ انہوں نے فرمایا کہ میرے والد صاحب نے ایک مرتبہ ان کو دعوت دی تھی جس پر انہوں نے فرمایا: ''اگر اسلام آگیا تو سارے لوگ لُنجے (ہاتھ کٹے) نہ ہوجائیں۔''

دیکھا آپ نے پروپیگنڈے کا کمال۔ یہ صرف انہی پر موقوف نہیں، ہمارے ہاں طبقۂ اشرافیہ سے تعلق رکھنے والی اس طرح کی شخصیات جو بادشاہ یا بادشاہ گر ہیں، کے دلوں میں یہ بات بٹھادی گئی ہے کہ اسلام کا تعارف ہاتھ پاؤں کاٹنے اور کوڑے پتھر مارنے سے ہے۔ باقی یہ کہ اسلام ہاتھ پاؤں کاٹنے سے پہلے چوری کے مرتکب کو کیا کیا سہولتیں دیتا ہے؟ کسی شہری کو چوری سے بچانے کے لیے اسلامی ریاست کیا جتن کرتی ہے؟ چوری کے جرم میں پکڑ لیے جانے کے بعد بھی اسے کیسے کیسے شبہات کا فائدہ دے کر بری کرتی ہے؟ ہاتھ کٹنے کے بعد وہ کمانے کے قابل نہ رہے تو پھر اس کی کفالت کی ذمہ داری کیسے نبھاتی ہے؟ ان سب باتوں کا سرے سے کوئی تذکرہ ہی نہیں۔

شرعی سزائیں کیوں ناگزیر ہیں؟

دنیا میں پانچ گناہ ایسے ہیں جن میں اس قدر طاقت ورکشش ہے کہ ان کا نشہ کسی کو چڑھ جائے تو اس وقت تک نہیں اُترتا جب تک اسے وہ سخت ترین سزا نہ دی جائے جو اسلام نے ان پانچوں گندے کاموں کے لیے مقرر کی ہے۔ (1) زنا۔ (2) شراب۔ (3) چوری۔ (4) ڈاکہ۔ (5) ایسی گالی جس میں کسی کی عزت پر تہمت لگائی گئی ہو۔ ان پانچ چیزوں میں ایسی شہوت انگیزی ہے کہ سخت ترین سزاؤں کے بغیر کوئی ان کو چھوڑ دینے پر آمادہ نہیں ہوسکتا۔ انسانی تاریخ کا مطالعہ اور انسانی نفسیات کا تجزیہ یہی بتاتا ہے کہ ان سزاؤں کے بغیر ان خطرناک جرائم کو معاشرے سے ختم ہی نہیں کیا جاسکتا۔ ان سزاؤں کا کمال ہے کہ ایک آدھ مرتبہ جاری ہوتے ہی ڈھیٹ سے ڈھیٹ مجرم بھی توبہ کرلیتا ہے اور ان سزاؤں کی بار بار نوبت ہی نہیں آتی۔ لہٰذا یہ کہنا ہی فضول ہے کہ اس طرح تو لوگ لُنجے یا منڈے ہوجائیں گے۔ نہیں خدا کی قسم نہیں! ان سزاؤں سے تو پورا معاشرہ لنجا منڈا ہونے سے بچ جائے گا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مغربی دنیا کو اور مغرب زدہ دنیا کو یہ باتیں ایسے انداز میں کون سمجھائے کہ وہ غلط فہمیوں کے بھنور سے نکل آئیں اور ان سزاؤں کی طرح اسلام کے دوسرے احکامات کے بھی دل سے قائل ہوجائیں۔

مسلمانوں کی ایک عظیم ذمہ داری:

اس وقت طالبان کی...... بلکہ ہر اس شخص کی جو اسلام کا نام لیتا ہے......سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ دنیا کو اسلام کا مطلب اس انداز سے سمجھائے کہ ان کے دل سے نہ صرف یہ کہ بے جا ڈر اور خوف نکل جائے بلکہ وہ دل سے اسلام کے چاہنے والے بن جائیں۔ دنیا والوں کے دل میں اسلام کا ایسا شوق اور ایسی رغبت پیدا کرنا جیسے کہ انصار صحابہ کے دل میں پیدا کردی گئی تھی کہ وہ ہجرت سے قبل بے تابانہ حضور علیہ السلام کا انتظار کررہے تھے، اس وقت اسلام اور مسلمانوں کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ خلافتِ بنوعباس اور خلافتِ بنی اُمیہ کے

زمانے میں لوگ دنیا بھر سے آ کر بغداد و دمشق کی رونقیں اور تعلیم و ترقی دیکھتے تھے اور جا جا کر اپنے ملکوں کے مفاد پرست حکمرانوں کو کوستے تھے۔ خلافت ہسپانیہ کے اعلیٰ نظم و نسق پر پورا یورپ رشک کرتا تھا۔ عثمانی خلفاء کے حسنِ انتظام کے چرچے پورے یورپ میں پھیلے ہوئے تھے اور یورپ اپنی تنگ دلی اور تعصب کے باوجود ان کی ترقی و کمال کو تسلیم کرتا تھا، کیونکہ وہ ان کے زیر انتظام شہروں میں سے کسی ایک شہر کی مثال لانے سے قاصر تھا۔ اگر اسلام دین برحق ہے اور یقیناً ہے، اگر اسلام دینِ فطرت ہے اور یقیناً ہے، تو پھر اس کو سن کر اس کے بارے میں فطری چاہت اور اسے سمجھ کر اس سے بے ساختہ دلی محبت پیدا ہو جانی چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہو رہا تو یہ ہماری تعبیر کی کمزوری ہے۔ یہ متکلم کی نہیں، ترجمان کی خامی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ والا اسلام:

ہمیں انصاف سے سوچنا چاہیے: کیا اسلام کا نام سن کر لوگ اس کے منصفانہ نظام کی طرف لپکتے ہیں؟ اس کے فلاحی انتظام کے گرویدہ ہو جاتے ہیں...... یا سہم جاتے ہیں؟ چور نظروں سے سر جھکا لیتے ہیں؟ ایسا کیوں ہے؟ ایسا اس لیے ہے کہ ہم ''عدلِ فاروقی'' کو پوری طرح نہیں اپنا رہے۔ ''ریاست فاروقی'' کے بے مثال نظم کی پوری تقلید نہیں کر رہے۔ ہم نے آدھا اسلام لوگوں سے چھپایا ہوا ہے۔ اسلام کا فلاحی، ترقیاتی اور کفالتی پہلو دنیا کی نظروں سے اوجھل ہے۔ اللہ کی قسم! اگر یہ چھپا ہوا اسلام دنیا کے لوگوں کے سامنے آ جائے تو وہ اپنے اپنے نظاموں کے خلاف بغاوت کر دیں گے۔ وہ ان نام نہاد انسانیت کش نظاموں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ کوڑا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی بہت مشہور تھا لیکن خود اہل مغرب عدلِ فاروقی پر انگشت نمائی کے بجائے ''خلافتِ فاروقی'' کے نظم کو ہم سے چھپا چھپا کر اپنانے پر مجبور ہیں۔ انہوں نے اپنے ممالک کو حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے فلاحی اُصولوں پر چلا کر ''ویلفیئر اسٹیٹ'' بنایا ہوا ہے۔ ایک مرتبہ تو اے این پی نے بھی کہا تھا کہ ہمیں اسلام قبول ہے لیکن ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ والا اسلام چاہتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ طالبان بھی حضرت عمر

فاروق رضی اللہ عنہ والا اسلام چاہتے ہیں، اے این پی بھی وہی چاہتی ہے، مغرب نے بھی وہی اسلام اپنا کر ظاہری ترقی حاصل کی ہوئی ہے تو پھر مسئلہ کیا ہے؟ اختلاف کس چیز پر ہے؟ ہم بھی وہی اسلام اپنا کر دنیا کو اسلام کا ویسا ہی گرویدہ کیوں نہیں بنا سکے جیسا کہ ہمارے لوگ مغربی ممالک کی سو خرابیوں کے باوجود ان پر فریفتہ ہیں۔ ان کا ویزا مل جانے کو تمناؤں کا حاصل سمجھتے ہیں۔ ہمارے ہاں سے انگریز کے چلے جانے کے باوجود اور انگریز کے اتنے ظلم و ستم کے باوجود انگریز کے فیشن اور اسٹائل کے دلدادہ ہیں۔

غیر منصفانہ نظام کا ردِ عمل:

بات صرف اتنی سی ہے کہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جب اپنے بعد خلافت کے لیے جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو نامزد فرما رہے تھے تو کچھ اکابر صحابہ نے اندیشہ ظاہر کیا کہ ان کے مزاج میں سختی ہے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی فراست نے جواب دیا کہ جب حکومت کی ذمہ داری کاندھوں پر پڑے گی تو خود نرم ہو جائیں گے۔ طالبان کو بھی حکومت مل جانے کے بعد اپنے رویے سے وہ درشتی بالجبر اور بتکلف ختم کر لینی چاہیے جو ان سے اور سوات کے عوام سے کی گئی۔ نصف صدی پر مشتمل حکومتی وعدہ خلافیوں اور غیر منصفانہ نظام کی وجہ سے فطری طور پر پیدا ہو گئی ہے۔ اب انہیں سیرتِ فاروقی کے اس پہلو کو اپنا کر اسلام کے اس فلاحی و ترقیاتی نظام کا بھرپور مظاہرہ کرنا چاہیے جس کے مطابق ریاست اسلامیہ کا سربراہ صرف یتیموں، بیواؤں اور مظلوموں کا سرپرست ہی نہیں، غیر مسلم بھکاری بوڑھے سے لے کر فرات کے کنارے...... جو اسلامی ریاست کی آخری حد تھی...... بھوکے پیاسے بکری کے بچے کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس کے ذمہ صرف یہی نہیں ہوتا کہ وہ رات کو گلیوں میں چکر لگا کر ملاوٹ کرنے والوں کا پتا لگائے، کمر پر بوری رکھ کر بھوک سے بلکتے بچوں کے گھر راشن پہنچا کر انہیں اپنے سامنے پکا کر کھلائے، بلکہ دن کو فلاحِ عامہ کے لیے نئے نئے منصوبے بنانا اور دنیا کو اسلام کے اس روشن انتظامی پہلو سے آشنا کرنا جسے دشمن بھی داغدار نہ کر سکیں، یہ بھی اس کی ذمہ داری

ہوتی ہے۔ بات اسلام کی نہیں، ادھورے اسلام کی ہے۔ مسئلہ سزاؤں کا نہیں، سہولتیں فراہم کرنے سے پہلے سزائیں دینے کا ہے۔ اعتراض سختی پر نہیں، سختی کے ایسے اظہار کا ہے جس میں سوقسم کی نرمیاں بلاوجہ چھپ جائیں اور ایک آدھ سختی ہی نو بیاہتا دلہن کو یاد رہ جائے۔

تعبیر کا فرق:

(3) ایک مرتبہ ایک ساتھی نے درخواست کی کہ ساتھ چلیں اور جرگہ میں بیٹھ کر ایک فیصلہ نمٹادیں۔ جھگڑا کچھ زیادہ نہ تھا لیکن درست طریقے سے نہ نبھانے کی وجہ سے بگڑ گیا تھا۔ یہ ساتھی بندہ کو اس لیے لے جانے پر اصرار کر رہا تھا کہ فریق مخالف شریعت کو مانتا نہ تھا اور یہ شریعت کے علاوہ کسی اور بات کو نہ مانتا تھا۔ صورتِ حال کافی پیچیدہ تھی۔ مولوی کی شکل دیکھ کر ہی سامنے والے بدک جاتے تھے۔ شریعت کا نام لیا جاتا تو یقین تھا کہ کفر بکنا شروع کردیں گے۔ دین اور شریعت کی توہین کے مرتکب ہوں گے۔ حق دار کو اس کا حق بھی دلوانا تھا اور سامنے والے کو شریعت کا انکار کر کے مرتد ہونے سے بھی بچانا تھا۔ جب بات چیت شروع ہوئی تو وہ نازک موقع آ گیا جب بات اُصولوں کی کرنی تھی اور دو دھاری تلوار پر چلتے ہوئے کرنی تھی۔ بندہ نے عرض کیا کہ جو کچھ آپ کر رہے ہیں یہ تو آپ کی روایات کے خلاف ہے۔ آپ کے بڑوں میں سے کسی نے آج تک ایسا نہیں کیا۔ کیا آپ دنیا والوں کو یہ کہنے کا موقع دیں گے کہ آپ اپنی خاندانی اخلاقیات اور روایات سے ہٹ گئے ہیں؟ آپ کو اپنے بڑوں کی شرافت اور شہرت کی لاج رکھنی چاہیے؟ حجت اور دلیل سے تو فریقِ مخالف اپنا حق ثابت کر ہی نہیں سکتا تھا، اخلاق اور روایت کی جکڑ میں جب آیا تو معاملہ خود ہی سدھر گیا۔ اگر اس موقع پر کہا جاتا کہ یہ شریعت کے خلاف ہے تو انہوں نے چھوٹتے ہی کہنا تھا کہ ہم آپ کی شریعت نہیں مانتے۔ آپ اپنی ملائیت اپنے پاس رکھیں۔ ان کا ایمان بھی جاتا اور ہمیں بھی کچھ نہ ملتا۔ شریعت چونکہ عمدہ اخلاقیات اور اچھی روایات کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اس لیے ان سے بات وہی کہی گئی جو شریعت نے سکھائی ہے لیکن طرز ایسا اختیار کیا گیا کہ دائرۂ شریعت میں رہتے

ہوئے بات بھی بن گئی اور غصے اور نفرت سے بھرا ہوا فریقِ مخالف ایمان کی دولت سے محروم ہونے سے بھی بچ گیا۔

اسلامک سوئٹزرلینڈ:

طالبان نے بہت اچھا کیا کہ اس معاہدے کا نام ”شریعت ریگولیشن“ کے بجائے ”نظامِ عدل ریگولیشن“ رکھا۔ اگر کوئی اس کی مخالفت کرے گا تو کم از کم کھلم کھلا شریعت کے لفظ کی مخالفت سے تو بچے گا۔ اس حکمت عملی کو جاری رکھنے کی ضرورت ہے۔ دنیا اسلام کے عجیب و غریب مفہوم کو ذہنوں میں جمائے بیٹھی ہے۔ وہ غیر شرعی نظام کی ناانصافیوں کا شکار ہونے کے باوجود شرعی نظام کے حوالے سے سہمی ہوئی ہے۔ اسے حوصلہ دینے، اسلام کی اصل تصویر دکھانے کی ضرورت ہے۔ پیاسے عوام کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فلاحی نظام کی خوبیوں سے سیراب کرنے کی ضرورت ہے۔ انسانیت کی روح ترس گئی ہے۔ اس کا انگ انگ پیاسا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آج ہوتے تو اپنی روایتی سخت گیری اور فطری منصف مزاجی کے باوجود کیا کرتے؟ وہ سہمے ہوئے، ترسے ہوئے، دکھی اور محروم لوگوں کے لیے آج کی دنیا میں کیا کرتے؟ آپ بھی اسی کو اپنا لیجیے۔ علامہ شبلی نعمانی کی ”الفاروق“ میں درج فاروقی نظام کے فلاحی کارناموں کو صفحات کے سینے سے نکال کر وادیٔ سوات کے پُر فضا سبزہ زاروں میں بکھیر دیجیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کوڑا اگر نظمِ عامہ کی خلاف ورزی کرنے والوں کی پیٹھ پر برستا تھا تو ضرورت مندوں اور بیواؤں کا سامان خادم کے موجود ہوتے ہوئے آپ خود اپنی پیٹھ پر لاد کر ان کے گھر تک پہنچاتے تھے۔ لوگ جب دیکھتے امیر المؤمنین بذاتِ خود ان کی خبر گیری کرتا ہے، ان کی کفالت کی اسے فکر رہتی ہے، وہ ان کو بھوکا دیکھ کر خود بھی پیٹ نہیں بھرتا تو وہ اس کی سختیاں بھول جاتے تھے۔ یہ سختیاں انہیں محبت بھری فہمائش لگتی تھیں۔ ناگزیر محسوس ہوتی تھیں۔ آپ بھی ایسا کریں۔ لوگوں کو آپ کے کارنامے نظر آئیں گے، وہ آپ کے خلاف پروپیگنڈے کو

بھول جائیں گے۔ وہ آپ کی انقلابی خدمات دیکھیں گے تو خود ہی آپ کے مخالفین کی زبانیں روک دیں گے۔ خود ہی آپ کے ترجمان اور آپ کی طرف سے وکیل بن کر دنیا کے اعتراضات کا منہ بند کردیں گے۔ آج کی دکھوں کی ماری دنیا میں بھی جس حکمران نے عوام کی خدمت کو اپنا فرض سمجھا، دکھوں کی ماری عوام نے اسے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ اسے ہیرو کا مقام دیا۔ کیوبا کے ''فیڈرل کاسترو'' سے لے کر سنگاپور کے ''لی کوآن یو'' تک کا آپ مطالعہ کریں۔ ''ماؤزے تنگ'' سے شروع کریں اور ''مہاتیر محمد'' تک آجائیں۔ فیڈرل کاسترو اور ہوگو شاویز کے تو مغربی دنیا بھی مخالف تھی اور ہے لیکن وہ ان دونوں کے عوام کو ان کے مخالف کرسکی نہ ان کے نظاموں پر ایسا اعتراض کرسکتی تھی جسے معقولیت کے ترازو میں تولا جاسکے۔ سزا تو معاشرے میں تخریب پیدا کرنے والے کے لیے ہوتی ہے اور تخریب تو کسی چیز کی تعمیر کے بعد ہوتی ہے۔ آپ پہلے سوات کو تعمیر کریں۔ اسے ''اسلامک سوئٹزرلینڈ'' بنادیں۔ دنیا پہلے اس کا قدرتی حسن دیکھنے جاتی تھی، اب اسے قدرتی خوبصورتی کے ساتھ شرعی حسن بھی دیکھنے کو ملے۔ پھر آپ جسے بھی سزا دیں گے، جس سے بھی سختی کریں گے، لوگ اس کے ساتھ اس سے بھی زیادہ سختی کا مطالبہ کریں گے جس نے اتنی خوبصورت وادی میں آگ لگانے، اتنے مثالی معاشرے میں گندگی پھیلانے کی کوشش کی۔

فوجدار اور خدمت گار:

بات لمبی ہوتی جارہی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ طالبان کو ''خدائی فوجدار'' ضرور ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر خدا کی خدائی میں امن نہیں آسکتا...... لیکن...... انہیں ''خدائی خدمت گار'' بھی اس سے بڑھ کر ہونا چاہیے۔ جس دن سوات میں کوئی بھوکا نہ سوئے گا۔ کوئی بے روزگار، کوئی بھکاری نہ ہوگا۔ کوئی ملاوٹ، دھوکا، بے ایمانی، بددیانتی، چور بازاری اور منافع خوری نہ کرے گا۔ کوئی سڑک ٹوٹی ہوئی، کسی پل کا کنارہ گرا ہوا نہ دکھائی دے گا۔ کوئی افسر کسی کو رشوت

دینے پر بے جا تنگ نہ کرے گا۔ لوگوں کے سرکاری کام جلدی اور بلا رکاوٹ ہونے لگیں گے۔ انہیں سوات ملک کے دوسرے خطوں سے زیادہ اچھا، زیادہ حسین لگے گا۔ اس کا حسن انتظام سرحد کے دوسرے علاقوں کی بہ نسبت زیادہ بہتر، زیادہ معیاری ہوگا...... ایسا معیاری جیسا کہ آج اگر شمالی علاقہ جات میں آغاخانی اسماعیلی ریاست بن جائے تو اس کا انتظام مثالی ہوگا...... جس دن مقامی عوام اور بیرونی سیاحوں کے لیے طالبان کا رویہ دلوں کو متاثر اور مسخر کرنے والا ہوگا۔ اس دن...... اس دن...... طالبان کو مخالفین کا جواب دینے کی ضرورت ہوگی نہ حامیوں کو مطمئن کرنے کی۔ اس دن اسلام کی اس نعمت کی تکمیل ہوجائے گی جو ہمارے پاس امانت ہے اور جسے اس کی اصل اور مکمل شکل میں دنیا والوں تک پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے۔

www.alkalam.pk

اسلامی نظام ریاست کے دو پہلو

زیر نظر تحریر پچھلے کالم کی طرح چند حقیقی واقعات سے ملنے والی سبق آموز نصیحتوں پر مشتمل ہے۔ نصیحتوں کی کشید بندہ نے کی ہے، واقعات کی تقدیر خالق کائنات نے کی تھی۔ ان واقعات میں سے ایک اس وقت پیش آیا جب بندہ گاڑی سیکھ رہا تھا۔ ایک اس وقت جب گھڑ سواری سیکھنے کا شوق پورا کر رہا تھا۔ ایک اس وقت جب وہ طالب علم تھا اور بس کا کرایہ نہ ہونے کی وجہ سے پیدل چلنا پڑتا تھا۔ گاڑی کی عیاشی اور گھوڑے کا خواب پورا کرنے کی سکت تھی نہ ہمت۔

ہانڈی والوں سے وفاداری:

(1) آج سے ایک دو دہائیاں پہلے جب بندہ گاڑی چلانا سیکھ رہا تھا تو مجھے ایک صاحب ملے۔ انہوں نے بتایا کہ ہم اپنی زمینوں میں اس وقت گاڑی رکھی ہوئی تھی جب ہماری دھرتی ٹائروں کے لمس سے نئی نئی آشنا ہوئی تھی۔ علاقے کے لوگوں کے لیے اس زمانے میں ''موٹر کار'' ایک عجوبہ تھی اور اس عجوبے نے بڑے عرصے تک ہمارا ساتھ نبھایا۔ اس کی وجہ ان کے استاد کی دو نصیحتیں تھیں جو انہوں نے آخری دن ان کو کیں: (1) گاڑی پر کبھی اضافی بوجھ نہ لادنا۔ (2) اپنی غلطی سے زیادہ دوسروں کی غلطی سے بچنے کی کوشش کرنا۔ ان نصیحتوں پر عمل کی برکت سے گاڑی کے فولادی پرزوں کو کبھی مکینک کی آہنی جراحی کی حاجت نہ ہوئی اور اس طرح چار پہیوں والی گاڑی نے زندگی کی بغیر پہیوں والی گاڑی کا بہت عرصہ تک ساتھ دیا۔ بندہ نے بھی یہ دو نصیحتیں سن لیں۔ پہلی نصیحت پر تو اکثر و بیشتر عمل نہیں کیا۔ اکثر اوقات ساتھ موجود ساتھی، طلبہ اور فقیر ملنگ اتنے ہوتے ہیں کہ گاڑی کی چولیں ہلتی محسوس ہوتی ہیں، مگر گاڑی کا

www.alkalam.pk

نقصان کھلتا ہے نہ وہ نصیحت یاد رہتی ہے۔ بس ذہن میں یہی ہوتا ہے کہ جاپان جانے اور اس کا تیار کردہ کھٹولا۔ ہم اپنے کسی ''ہانڈی وال'' کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔ اس طرح جب سے اللہ پاک نے گاڑی دی، زندگی میں یاد نہیں کہ کسی نے لفٹ مانگی ہو اور بندہ نے گاڑی نہ روکی ہو۔ متعدد مرتبہ قریبی ساتھیوں نے سمجھایا۔ بزرگ حضرات نے شفقت بھری ڈانٹ پلائی، لیکن ایسا کبھی ممکن نہ ہوا کہ کسی کو راہ کھڑے چھوڑ کر گزرتے چلے جائیں۔ دوسری نصیحت کو البتہ ایسا پلے باندھا ہے کہ گاڑی میں سفر کے ساتھ ہی مخصوص نہیں رہی، زندگی کے سفر میں بھی ہمیشہ مدنظر رہتی ہے۔

ایک فلسطینی کہاوت:

غلطی غلطی ہوتی ہے چاہے انسان خود کرے، چاہے دوسرے کی غلطی کا شکار ہو۔ غلطی کا نقصان، نقصان ہوتا ہے۔ چاہے انسان نے اپنی نادانی سے غلطی کا ارتکاب کیا ہو یا کسی کے گھیر گھار کر غلطی کروانے سے ایسا ہوا ہو۔ جب کوئی تحریک اپنے دورِ آغاز میں ہو تو اس کی غلطی اتنی سنگین نہیں ہوتی جتنی کہ اس وقت جب وہ اس منزل کو حاصل کرلے جس کی خاطر قربانی دی گئی تھی۔ طالبان کو نہ صرف اپنی غلطی سے بچنا چاہیے بلکہ ان غلطیوں سے بچنے کی کوشش بھی ان پر فرض ہے جو انسان نادانستگی میں اس وقت کر جاتا ہے جب اسے خیال نہیں ہوتا کہ وہ خود یہ غلطی کر رہا ہے یا کوئی اس کے لیے ایسے حالات پیدا کر رہا ہے کہ وہ لغزش کا ارتکاب کیے بغیر نہ رہ سکے۔ کچھ لوگ مرد میدان ہوتے ہیں۔ وہ میدان مار سکتے ہیں لیکن جب بات لفظوں کی جنگ کی آتی ہے تو معرکے کی نوعیت بدل جاتی ہے اور فلسطینی کہاوت (یہ کہاوت فلسطینی مجاہدین کی نمائندہ تنظیم حماس کا ایک اصول ہے) ''ایک ہاتھ بناتا ہے اور ایک ہاتھ روکتا ہے'' پر عمل ان کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ دراصل میدان کی بنی ہوئی ساکھ کو میڈیا میں خود پر قابو پا کر برقرار رکھنے کے لیے بہت زیادہ علم و حلم درکار ہے۔ دینی تحریکوں کو لفاظی کے معرکے کے لیے لفظوں کی دنیا سے کچھ آدمی لینے چاہییں جو ان کے موقف کی درست تعبیر کریں اور یہ تعبیر تقاضائے

حال کے مطابق بھی ہو اور علم وحکمت پر مبنی بھی۔ ہمارا معاشرہ بیمار معاشرہ ہے۔ ذہنی وعملی طور پر بگڑا ہوا معاشرہ ہے۔ اس کو اسلام کا قائل کرنے میں ہم سستی اور غلطی کر جائیں تو اتنا نقصان نہیں، جتنا دنیا اسلام سے متنفر کروانے کے عالمی دخیل کاروں کی کروائی ہوئی کسی لغزش کا شکار ہونے سے ہوسکتا ہے۔

ایمان وعقل کا امتحان:

اس کی مثال کے لیے ہم حماس کے قائد شیخ احمد یاسین کے ایک انٹرویو سے مدد لے سکتے ہیں جس میں اسرائیلی انٹرویوکار نے بہت کوشش کی کہ شیخ اسرائیل کے مفاد کی بات کہہ ڈالیں یا پھر وہ ان سے ایسا لفظ کہلوالے جس سے ان کے حامیوں کا اعتماد ان پر سے اُٹھ جائے، لیکن شیخ نے...... جو معذور ومفلوج اور گرفتار تھے...... نہ صرف یہ کہ بڑی حکمت سے ہر سوالیہ حربے کا جواب دیا بلکہ بڑی عزیمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں یا حمایتیوں کی حوصلہ شکنی کرنے والا ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا۔ انٹرویو میں کیے گئے سوالات کے اندر چھپے اسرائیلی ہتھکنڈوں اور شیخ کے کامیاب دفاع کو سمجھنے کے لیے اس پس منظر پر بھی ایک نظر ڈالنی ہوگی جس کے تناظر میں ایمان وعقل دونوں کا بیک وقت امتحان لینے والی یہ گفتگو ہوئی تھی۔ پس منظر کچھ یوں ہے کہ حماس کی تحریک ''انتفاضہ'' شروع میں مسلح تحریک نہ تھی۔ شروع میں اس کے اقدامات سول نافرمانی پر مشتمل تھے جن کا مقصد اسرائیلی قابضین کو فلسطینیوں کے ساتھ شریفانہ سلوک پر مجبور کرنا تھا۔ لیکن اسرائیل نے ''انتفاضہ'' کے اس مطالبے کو قابلِ توجہ نہ سمجھا اور مسلسل ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتا رہا۔ چنانچہ نوجوان فلسطینیوں کا ردِعمل بھی سخت سے سخت ہوتا چلا گیا۔ 13 دسمبر کی صبح کو حماس کے ایک گروپ نے اسرائیلی بارڈر پولیس کے ایک 29 سالہ سارجنٹ میجر نیسیم ٹولیڈانو کو اغوا کرلیا۔ اس کا گھر ''لُد'' میں تھا اور وہ مغربی کنارے کے شہر ''رام اللہ'' میں اپنی ڈیوٹی پر جارہا تھا کہ حماس کے گروپ نے اسے یرغمال بنا کر ایک محفوظ جگہ پر پہنچادیا اور دو نقاب پوشوں نے 11 بجے قبل دوپہر بین الاقوامی ریڈکراس کے رام اللہ آفس میں یہ

پیغام پہنچادیا کہ یرغمالی کو ان تین شرطوں پر رہا کیا جاسکتا ہے:

(1) اسرائیلی حکام ایک مقررہ ڈیڈلائن (اسی روز 9 بجے رات) پر عمل کریں، ورنہ یرغمال شخص کو ہلاک کردیا جائے گا۔

(2) شیخ احمد یاسین کو انٹرنیشنل ریڈکراس کے نمایندے کی موجودگی میں رہا کیا جائے، اس موقع پر مصر، فرانس، سویڈن اور ترکی کے سفیر بھی موجود رہنے چاہییں اور اسرائیلی حکام ان کے روبرو یہ اعلان کریں کہ وہ دوبارہ شیخ کو گرفتار نہیں کریں گے۔

(3) شیخ احمد یاسین کی رہائی، سفیروں کی موجودگی، اسرائیلی حکام کے وعدے اور اغوا شدہ فوجی کی رہائی کے عمل کو میڈیا پر کوریج دی جائے۔

الٹی ہوگئیں جب تدبیریں:

الٹی میٹم کی ڈیڈلائن ختم ہونے سے دس گھنٹے قبل اسرائیل نے ایسی ہنگامی حالت نافذ کردی جس کی اکتوبر 1973ء کی جنگ کے بعد سے کوئی مثال موجود نہیں تھی۔ ساتھ ہی انہوں نے وقت کے ساتھ اس اُمید پر ''کھیلنا'' شروع کردیا کہ اس دوران اغوا کاروں کی شناخت ہوجائے یا اس جگہ کا پتا چل جائے جہاں یرغمالی کو رکھا گیا تھا۔ اس حربے سے بجائے فائدہ کے، اسرائیل کا نقصان ہوا۔ حماس کو پہلی بار عالمی میڈیا کی کوریج ملی اور وہ پوری دنیا کی توجہ کا مرکز بنی۔ اغوا کاروں کو متاثر کرنے کے لیے آخری کوشش کے طور پر اسرائیلی حکام نے اس اُمید پر شیخ احمد یاسین کا اسرائیلی ٹی وی پر انٹرویو لیا کہ وہ یرغمالی کی رہائی کے لیے اپیل کردیں گے۔ اسرائیل کے اس منصوبے کے برخلاف اس انٹرویو نے حماس کو اتنے وسیع پیمانے پر پبلسٹی دی کہ اس نے کبھی سوچا تک نہیں تھا۔ شیخ اس وقت بہت علیل تھے۔ انہوں نے اغوا کاروں سے اپیل کی کہ وہ یرغمالی کو زندہ رکھیں اور اسرائیلیوں پر بھی زور دیا کہ وہ مطالبات تسلیم کرلیں۔ اس طرح انہیں اسرائیلی عوام سے براہِ راست مخاطب ہونے کا موقع ملا۔ اگرچہ بات مختصر ہی تھی۔ شیخ نے اسرائیل اور فلسطینیوں کے مابین کشمکش کے بارے میں اپنی تحریک کی پوزیشن بیان کی

اور بڑے نپے تلے لفظوں میں عزیمت واستقامت اور حکمت وبصیرت کے شاندار امتزاج پر مبنی دوٹوک جواب دیے۔ ان کے انٹرویو کے چند اقتباسات یہ ہیں:

☆......☆......☆

”سوال: ایک مسلح گروپ نے ایک اسرائیلی سپاہی کو اغوا کرلیا ہے اور وہ اب آپ کی رہائی کا مطالبہ کررہا ہے، اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

شیخ یاسین: کوئی شخص آزاد ہونے سے انکار نہیں کرتا اور کوئی شخص زنجیروں میں جکڑا جانا بھی پسند نہیں کرتا۔ میرا ایمان ہے کہ ہر محبوس شخص ایسے سیاسی حالات میں، جن سے ہم گزر رہے ہیں، حق رکھتا ہے کہ اسے فوراً رہا کردیا جائے۔

سوال: اگر انہوں نے پولیس مین کو قتل کردیا تو؟

شیخ یاسین: میں تو اس بات کو پسند نہیں کرتا، انہیں چاہیے کہ حکام کو کچھ مہلت دیں تاکہ وہ ان کے مطالبات پورے کرسکیں۔

سوال: اس پولیس مین کے قتل کے بارے میں آپ کا کیا موقف ہوگا؟

شیخ یاسین: پولیس مین کا قتل، فلسطینی باشندوں کا قتل اور فوجیوں کا قتل، یہ سب کچھ اس سرزمین پر ناجائز قبضے کے شاخسانے ہیں۔ اس سبب کو دور کردیا جائے تو سارے مسئلے حل ہوجائیں گے۔

سوال: اس پولیس مین کے اغوا کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

شیخ یاسین: کیا یہ واقعہ کوئی الگ تھلگ چیز ہے؟ یہ اسی قبضے کے چکر کا ایک حصہ ہے۔ ہر روز دونوں جانب لوگ قتل ہورہے ہیں۔ جب ہم قبضے کے حالات تبدیل کردیں گے، سب کچھ اپنے آپ ختم ہوجائے گا۔

سوال: اگر انہوں نے پولیس مین کو قتل کردیا تو؟

شیخ یاسین: میں اس سے اتفاق نہیں کرتا کہ وہ اس کو قتل کردیں گے۔ ایک اغوا کار کے

کچھ مقاصد ہوتے ہیں اور وہ اپنے ارادے کا مالک بھی ہوتا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ وہ اپنے مقاصد پورے کرنے کا مطالبہ کرے گا۔ حکام کو ان مقاصد کو پورا کرنے پر غور کرنا چاہیے۔

سوال: مقبوضہ علاقے میں آج آپ حماس کی کتنی قوت پاتے ہیں؟

شیخ یاسین: یہاں بیٹھ کر تو میں کوئی اندازہ نہیں کرسکتا۔ قید وبند میں رہتے ہوئے میں کیسے مشاہدہ کرسکتا ہوں؟

سوال: آپ کو جیل میں آنے والے ملاقاتیوں اور قیدیوں نے کیا بتایا ہے ہمیں اس سے مطلع کیجیے۔

شیخ یاسین: میڈیا سے تو صرف یہی سن رہا ہوں کہ حماس تحریک میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے۔

سوال: اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟

شیخ یاسین: اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی حل ہی اس کا واحد متبادل ہے۔

سوال: امن کے اقدامات (پروسیس) اور واشنگٹن مذاکرات کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

شیخ یاسین: کوئی ایک فلسطینی بھی امن کو مسترد نہیں کرتا۔ ہر فلسطینی اسے پسند کرتا ہے تاہم آپ جس قسم کا امن چاہتے ہیں وہ میری پسند کے امن سے مختلف ہے۔ ہر ایک کے پاس امن کے لیے ذرائع اور ایک طریق کار موجود ہے۔

سوال: آج جو مذاکرات ہونے جارہے ہیں، ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

شیخ یاسین: اب تک تو ان سے کچھ نہیں بن پایا۔ میں شروع سے ہی یہی سمجھتا آرہا تھا کہ ان سے کچھ بھی نہیں ہوسکے گا۔ کیونکہ ان میں توازن کی کمی ہے۔“

☆......☆......☆

آپ دیکھیے کہ سوال 2 سے 5 تک انٹرویو کار نے مسلسل کوشش کی ہے کہ شیخ سے اس اسرائیلی یرغمالی کے قتل یا اغوا کے بارے میں ایسی بات کہلوائے جو دنیا بھر کے میڈیا کے سامنے حماس کو خراب کرنے کا بہانہ بن سکے۔ اس نے مسلسل ایک ہی سوال گھما پھرا کر چار طریقے سے بدل کر کیا ہے اور شیخ نے چاروں مرتبہ ایک ہی جواب بڑی خوبی اور صفائی سے دیا ہے۔

لطفِ سخن اور قہرِ سخن کے بیچوں بیچ:

(2) دوسرا مشاہدہ گھڑسواری سیکھنے کے دنوں کا ہے۔ بندہ نے دو طرح کے اساتذہ سے گھڑسواری سیکھیں۔ ایک کراچی ریس کورس کے قریب رحمانیہ رائیڈنگ اسکول میں ہوتے ہیں استاد عبدالقادر صاحب (0312-5087635-0301-2258647)۔ دوسرے ساحل سمندر پر اپنا رائیڈنگ کلب چلاتے ہیں۔ ملک امان اللہ صاحب (0300-2043210) دونوں ہی اپنے فن کے ماہر اور مشاق اساتذہ تھے۔ عمر ہی اس شغل میں بسر کی تھی، مگر دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ایک تھیوری پر زور دیتے تھے دوسرے پریکٹیکل پر۔ ایک ہر چیز کو تفصیل سے ذہن نشین کروا کر پھر زین کے قریب لاتے تھے۔ دوسرے پہلی جست میں گھوڑے پر بٹھا دیتے تھے۔ بقیہ باتیں ساتھ چلتے چلتے ہوتی تھیں۔ دونوں حضرات کا اپنا اپنا انداز تھا۔ کسی کا بالواسطہ، سہج سہج کر۔ کسی کا براہِ راست، یک لخت اور یکدم۔

ہمارے ہاں دینی تحریکوں اور تنظیموں میں دونوں طرح کے رویے ملتے ہیں۔ کچھ کے ہاں فکر ہی فکر ہے۔ نظریہ سازی ہی نظریہ سازی ہے۔ ہندی کی چندی ہے۔ عمل کا وقت آ کے دینے کا نہیں؟ اگر آیا تو اتنی بات طے ہے کہ وہ خود بخود آ ئے گا۔ اس میں ان کی بلند فکری کا کوئی دخل نہیں ہوگا۔ کچھ کے ہاں معاملہ برعکس ہے۔ بس ”کش اور ڈز“ ہے۔ ہمہ وقت حرکت اور تحرک کا دور دورہ اور زورازوری ہے۔ نظریاتی تربیت کا جسمانی تربیت جتنا یا اس جیسا اہتمام نہیں۔ ذہنی اور قلبی قوتوں کی اصلاح داخل نصاب نہیں۔ جس کارکن نے زندگی وقف کی ہے۔ جو جان دینے پر تیار ہے، اس کی نظر وفکر کی بنیادیں بھی اس طور پر استوار نہیں کی گئیں کہ وہ کسی کا

نظریہ بنا سکے یا؟ مخالف کے اشکالات کا تسلی بخش جواب دے سکے۔ اس ”لطف سخن“ اور ”قہر سخن“ کے بیچوں بیچ ملت کی گاڑی پھنسی ہوئی ہے۔ یوں سمجھیے! بس اللہ ہی اللہ ہے۔ یہ دونوں رویے قابل اصلاح ہیں۔ نمونہ کے لیے ہمیں پھر حماس سے رجوع کرنا پڑے گا۔

عوام میں کام کے چار شعبے:

1980ء سے 2009ء تک حماس کی تاریخ دعوت سے جہاد تک یعنی نظریے سے عمل تک کی جامع تربیت کی لازوال اور سبق آموز تاریخ ہے۔ 1967ء میں عرب ممالک کی شکست اور اس کے نتیجے میں دریائے اُردن کے مغربی کنارے، غزہ کی پٹی، سینا کے صحرا اور گولان کی پہاڑیاں، ان چار اہم ترین جگہوں پر اسرائیل کے غاصبانہ قبضے نے فلسطین کاز کے لیے متعدد سنگین مسائل پیدا کر دیے۔ سیدھے سیدھے یوں کہیے کہ فلسطین کے مسلمانوں کے لیے موت اور زندگی کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اب انہوں نے زندہ رہنے کے لیے کچھ کرنا تھا یا پھر موت کی وادی میں بھٹک جانا تھا۔ تیسرا راستہ کوئی نہ تھا۔ اس وقت انہوں نے تاریخی فیصلہ کیا اور دو راستوں پر چل پڑے:

(1) پہلا راستہ عسکریت کا تھا۔ یہ دریائے اُردن کے مغربی کنارے میں قابض اسرائیلی فوجیوں کے خلاف مسلح جہاد کی صورت میں اختیار کیا گیا۔ اس تجربے میں ان کے ساتھ ساتھ مصر، شام، اُردن، یمن اور خلیج کے ممالک سے رضا کار آ کر شامل ہوئے۔

(2) دوسرا راستہ صہیونی قبضے کے خلاف جہاد کے لیے تنظیمی ڈھانچے کا قیام تھا۔ اس مقصد کے لیے درج ذیل چار شعبوں میں کام کرنے کا فیصلہ کیا گیا:

(1) فلسطین میں نئی مساجد کا قیام، کیونکہ مساجد معاشرے میں اثر ورسوخ اور دینی تربیت کا اصل ذریعہ ہیں۔

(2) خیراتی اور سماجی اداروں کا قیام۔ ان میں اسلامک سینٹرز اور غزہ کی پٹی میں اسلامک سوسائٹی کے قیام کے علاوہ مغربی کنارے میں زکوٰۃ کمیٹیوں اور خیراتی اداروں کا قیام

بھی شامل ہے۔

(3) نوجوانوں خاص طور پر یونیورسٹی گریجویٹس کو تحریک میں شامل کرنا۔ فلسطینی طلبہ کو جو مواقع میسر تھے اس گروپ نے ان سے فائدہ اُٹھایا۔ طلبہ کو بیرون ملک یونیورسٹی کی تعلیم کی سہولت حاصل تھی جو بعد میں تحریک کے لیے لیڈرشپ کی ٹھوس بنیاد ثابت ہوئی۔

(4) تحریک کے ارکان میں دعوت وتبلیغ اور سماجی اصلاحات کے لیے جوش وجذبہ بیدار کرنا۔ عوام میں صہیونی عزائم کے مقابلے کے لیے فلسطینی کاز کی حوصلہ افزائی اور اس تنازع کے حقیقی پہلو کو واضح کرنا۔

ان چاروں شعبوں میں ربط دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کس ایمانی حکمت اور سیاسی بصیرت سے قوم کی نظریاتی تربیت کے لیے کام کو مساجد سے اُٹھا کر کالج یونیورسٹیوں کے پڑھے لکھے نوجوانوں تک اور پھر ان کے ذریعے اَن پڑھ عوام تک پھیلایا گیا۔ اس دوران مساجد کو مرکز بنا کر فلاحی کاموں سے لے کر اسرائیل وفلسطین تنازع کی حقیقت عوام کو سمجھانے تک کیسا ہمہ جہت کام کیا گیا۔ اسکول وکالج کا نصاب درست کر دیا جائے تو انہیں بند کرنے کی ضرورت نہیں رہتی اور عوام کو دین کی حقیقت سمجھا دی جائے تو وہ خود نظریاتی ترجمان بن جاتے ہیں۔ تحریکی کارکنوں کو ہر جگہ جوابداری کے لیے جانا ہی نہیں پڑتا۔ لیکن ایسا ہوتا اس وقت ہے جب عوام کو اپنا سمجھ کر، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قابل رحم اُمتی سمجھ کر، دین دار بنانے اور ہمدردی ودل سوزی کے ساتھ غیروں کے چنگل سے نکالنے کی سنجیدہ اور گرم جوش کوشش کی جائے۔ وعظ ونصیحت کا عمل جب پورا ہو جائے اور ایک عرصے تک پوری محنت کے ساتھ پورا کیا جائے تو پھر اس کے بعد اس میں رکاوٹ بننے والوں کی سرزنش کا وقت آتا ہے۔ اس سے پہلے تو نصیب کے مارے اُمتیوں پر ترس کھانے کی اور ان کی جرائم زدہ سوچوں اور جراثیم آلودہ نظریات کو اپنے حسن کردار کا بہترین نمونہ دکھا کر تطہیر کی ضرورت ہے۔

طالبان کے کارکنوں کو مساجد سے اسکولوں کالجوں تک نظریاتی دعوت اور ہسپتالوں

سے سڑکوں تک عوامی خدمت پر بھرپور محنت کرنی ہوگی۔ اس کے بغیر ادھورا کام ادھورا نتیجہ دے گا اور سمجھ نہ آئے گا کہ گوٹ کہاں اٹکی ہوئی ہے؟ زنجیر کی کون سی کڑی غائب ہے؟

مقبولیت کا راز:

(3) تیسرا واقعہ ہمارے ایک استاد کا ہے۔ وہ بہت سخت مزاج تھے لیکن ان کی سختی کے باوجود طلبہ ان کے بہت قریب اور گرویدہ تھے۔ ان کی درشتی سے لطف لیتے تھے۔ ایک تو اس لیے کہ وہ اپنے فن میں کامل تھے۔ دوسری وجہ یہ کہ ہر طالب علم کی ذاتی ضروریات کا خیال رکھتے اور اگر کسی کے سرہانے رات جاگنا بھی پڑتا تو دریغ نہ کرتے تھے۔ نیز وہ دن کو جس پر سختی کرتے، رات کو تہجد میں اس کا نام لے لے کر دُعائیں کرتے اور تجربہ تھا کہ ایک مرتبہ جس کو ان کے ہاتھ لگ جائیں وہ سدھر جاتا تھا۔ الا یہ کہ بدنصیب ہو اور ان کی سختی پر صبر کے بجائے بدزبانی میں مبتلا ہو۔ ان سے کسی نے پوچھا کہ دوسرے اساتذہ بہت نرم ہیں لیکن ان سے اتنا فیض پہنچتا ہے نہ طلبہ ان کی خدمت میں جمع رہتے ہیں۔ کیا وجہ ہے؟ اس وقت خاموش ہو گئے۔ بعد میں فرمایا کہ جب آپ طلبہ کو ان کا حق دے دیں یعنی تعلیم وتربیت میں محنت کریں اور ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے جان کھپائیں تو پھر وہ آپ کو آپ کا حق ضرور دیں گے۔ آپ کی سخت مزاجی کے باوجود آپ کی اطاعت میں فخر محسوس کریں گے۔

اسلامی ریاست کے دو پہلو:

اسلامی ریاست کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک میں وہ آمر اور مخدوم ہوتی ہے۔ دوسرے میں وہ خادم اور عوامی کارکن ہوتی ہے۔ پہلا پہلو نظامی ہے جس میں وہ عوام سے قوانین پر عمل کرواتی ہے۔ محصولات وصول کرتی ہے۔ حکم دیتی، روکتی ٹوکتی اور گڑبڑ کرنے والوں پر سزائیں جاری کرتی ہے۔ دوسرا پہلو فلاحی ہے کہ وہ اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر عوام کے لیے سہولتیں فراہم کرتی ہے۔ ان کی مشکلات کو اپنی مشکلات سمجھتی ہے۔ ان کے پیسے کو انہی پر خرچ کرتی ہے۔ کارکنوں کو نوازنے سے پہلے عوام کے مسائل حل کرتی ہے۔ پہلا پہلو قانونی

ہے دوسرا اخلاق۔ پہلے میں حکم چلانے کا سرور ہے، دوسرے میں خود کو مٹانے کا۔ پہلے کے مطابق امارت پھولوں کی سیج ہے۔ دوسرے میں نازک امانت ہے۔ شرعی ذمہ داری ہے اور ایسا بوجھ ہے جس کو اُٹھانے والا عوام کا محبوب بن جاتا ہے۔ دنیا نے طالبان کا ایک رُخ دیکھا ہے۔ اب وہ دوسرا دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ دیکھنا چاہتی ہے طالبان کا حلیہ اور لباس ہم نے اپنا لیا ہے، گھروں سے ٹی وی ڈش ہم نے نکال دیا ہے، اب ہمارے گھروں میں بجلی، پانی، گیس اور ٹیلی فون کی سہولتیں آتی ہیں یا نہیں؟ انصاف ہماری دہلیز تک پہنچتا ہے یا نہیں؟ سوات میں صحت اور صفائی کا معیار کیسا ہے؟ سوات بورڈ کا تعلیمی معیار ملک کے دوسرے بورڈز سے سبقت لے جاتا ہے یا نہیں؟ یہاں کے ہسپتال میں مسیحا مسکراہٹیں بکھیرتے ہیں یا قصاب چھریاں چلاتے ہیں؟ پہلے میں عوام حکمران سے شاکی رہتے ہیں۔ جیسا کہ مدارس میں طلبہ ناظم صاحب سے شکوہ کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے میں وہ جانا چاہے تو عوام اسے نہیں جانے دیتے۔ اس سے تا حیات وفا کا عہد کرتے ہیں اور اس سے وفا نبھانے کے لیے اپنا سب کچھ وار دیتے ہیں۔ جیسا کہ سلطان فتح علی ٹیپو کے ساتھ ہوا۔ اس کی شہادت پر ہندو عورتیں اس کے جنازے کے ساتھ روتی اور گریہ وزاری کرتی چل رہی تھیں۔ سلطان نے تو سارا عرصہ انگریز کے ساتھ جنگ میں گزارا تھا پھر کس چیز نے غیر مسلم کمیونٹی کی خواتین تک کو زندگی بھر اس کے لیے دُعائیں کرتے اور مرنے کے بعد رونے پر مجبور کیا۔ اس کی وجہ وہ فلاحی و رفاہی کام تھے جن سے سلطان نے مسلسل جنگ میں مصروف ہونے کے باوجود غفلت نہ برتی۔ اس کی وجہ عوام کی امانتوں (ٹیکسوں) کا انہی پر استعمال، ان کی حفاظت کے لیے ایثار و قربانی اور ان کے ساتھ بے لوث خیر خواہی تھا۔

شرعی سیاست خدمت کا دوسرا نام ہے:

اس آخری نکتے کو ہم سنوسی تحریک کے بارے میں لکھے گئے دو پیراگراف سے مزید سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلے اس نکتے کو دوبارہ سمجھ لیں۔ آخری نکتہ یہ ہے کہ امیر یا تحریک

کے سربراہ عوام کو وہ کچھ دیں جو مامور کا جائز حق ہے۔ پھر عوام انہیں بخوشی وہ سب کچھ دینے پر تیار ہوں گے جو امیر کا جائز حق ہے۔ ہر طرف اگر یہی نظر آئے گا کہ امر ہی امر ہے۔ خدمت خاطر، غمخواری اور غمگساری تو ہے نہیں تو یہ بات شریعت کے مزاج اور سیاست کے اُصول کے خلاف ہوگی۔ (عربی میں سیاست عوام کے مسائل کے شرعی اور معقول حل کا دوسرا نام ہے) لیبیا اور الجزائر میں سنوسی تحریک وہاں کے علماء اور مشائخ کی برپا کردہ کامیاب ترین تحریک تھی جس نے اطالوی اور فرانسیسی تسلط کے خلاف جہاد کا پرچم بلند کیا اور کمال یہ تھا کہ جہاد کے ساتھ دعوت وارشاد اور خدمت خلق کا ایسا بہترین نظم جاری کیا کہ آج تک ان علمائے کرام اور پیران گرامی کی فراست اور وسعت نظری پر دنیا حیران ہے۔ بیسویں صدی کے انسائیکلو پیڈیا کی پانچویں جلد میں محمد فرید وجدی ”سنوسی تحریک“ اور اس کے بانی محمد بن علی سنوسی کا تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اس تحریک کے مراکز ”زاویہ“ کہلاتے تھے۔ ہر زاویے میں ایک مسجد، ایک مدرسہ اور ایک تربیت گاہ ہوتی تھی۔ مسجد میں عبادت، مدرسہ میں تعلیم اور خانقاہ میں اصلاح ہوتی تھی۔ ہر زاویے کے ساتھ ایک زرعی فارم ہوتا تھا۔ زاویے کا نگران کارکنوں کے ساتھ اس میں کام کرتا اور اپنے زاویے کا خرچ نکالنے کے بعد اپنے شیخ اکبر کو بھیج دیتا تھا۔ اس طرح تحریک کی ضروریات پورے ہونے کے ساتھ ایک بڑا فنڈ اکٹھا ہو جاتا تھا۔ یہ دیکھ کر لوگوں کی ان سے عقیدت بہت بڑھ گئی تھی اور وہ دور دور سے ان کے پاس محض دُعا کروانے آتے تھے۔“ (دائرۃ معارف القرن العشرین، ج:5، ص:313)

ڈاکٹر جمیل عبداللہ مصری ”حاضر العالم الاسلامی“ میں سنوسی تحریک کا تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں:

”شمالی افریقہ میں یورپی استعمار کے خلاف جہاد کا پرچم اس تحریک نے بلند کیے رکھا۔ اس نے ایک پوری نسل کی تربیت اسلامی شخصیت کی تعمیر کے اصولوں پر اس طرح سے کی کہ اس

تربیت یافتہ نسل نے افریقہ کے مختلف حصوں میں اسلام کی نشر واشاعت کا فریضہ انجام دیا۔ان کا ''زاویہ'' ایک مسجد، قرآن کریم کی تحفیظ کے مکتب، اسلامی علوم کے مدرسہ، کتب خانہ اور دور سے آنے والے مسافروں اور طلبہ کے لیے مہمان خانہ پر مشتمل ہوتا تھا۔صرف ''جغبوب'' کے زاویہ میں تفسیر و حدیث، فقہ، اسلامی تاریخ اور دیگر علوم پر آٹھ ہزار کتابیں موجود تھیں۔''
(684، مطبع: مکتبۃ العبیکان)

الغرض دینے والا ہاتھ ہمیشہ اوپر رہتا ہے۔آدمی دینا سیکھ جائے تو لوگ خود اس کی برتری مان لیتے ہیں۔اس کا ہاتھ اونچا رکھنے کے لیے اپنے آپ کو جھکا لیتے ہیں۔سابق اور معاصر تاریخ اور عقل و نقل اس پر متفق ہے۔متفقہ چیزوں سے ملنے والا سبق مجرب نسخہ ہوتا ہے۔ایسا نسخہ جو نشانے پر لگ کر رہتا ہے۔فرق صرف جلدی یا دیر کا ہوتا ہے۔اثر کرنے یا نہ کرنے کا نہیں۔اسلام کا ترقیاتی نظام متعارف کروایا جائے۔اسلام کے کفالتی نظام کی برکات سے پسے ہوئے استحصال زدہ عوام کے دکھوں پر مرہم رکھا جائے۔شریعت کی حرام کردہ چیزوں سے ممانعت کے ساتھ حلال کردہ متبادل مباحات (جائز سہولیات و تفریحات) بہم پہنچائی جائیں، دولت کی منصفانہ تقسیم، اختیارات کا صرف اور صرف جائز استعمال اور گڈ گورننس کی اعلیٰ مثال متعارف کروائی جائے تو سوات ایسا مثالی خطہ بن جائے گا جس پر پورا پاکستان رشک کرے گا۔جس کے کامیاب نظام کو ہر ایک اپنے ہاں نافذ کرنے کے لیے بے چین و بے تاب ہوگا۔عطر وہ ہے جو خود مہکے، عطار کو اس کی خوبیاں نہ گنوانی پڑیں۔اللہ کرے ہم اس دور میں جبکہ شریعت کا مثالی نظام دنیا سے ناپید ہو چکا ہے اور دنیا اس کے لیے ترس رہی ہے، اسے نافذ کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔واللہ الھادی الی سبیل الرشاد.

مختصراً و بالاختصار

پہلے اور بعد کا فرق:

بات پھیلائی جائے تو لمبی ہوتی جاتی ہے۔سمیٹی جائے تو دو لفظوں میں سمٹ سکتی ہے۔طالبان سے دنیا...... یعنی ان کی ہمدرد دنیا...... جو کچھ چاہتی ہے، اسے دو لفظوں میں سمیٹا جا سکتا ہے: تنفیذ اور تدریج۔طالبان فی الحال جو کچھ کر رہے ہیں، اسے ''تدریج'' کے دائرے میں لے جائیں اور جو کچھ وہ بعد میں کرنا چاہتے ہیں، اسے ''تنفیذ'' کے دائرے میں لاتے ہوئے فی الحال اور فوراً شروع کر دیں۔تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ شریعت کے دو حصے ہیں۔ایک حصہ تنفیذ چاہتا ہے ایک تدریج۔یعنی ایک فوری نفاذ چاہتا ہے ایک دھیرے دھیرے۔بات صرف اتنی سی ہے کہ کون سا فوری ہو اور کون سا رفتہ رفتہ، وقت کے ساتھ، آہستہ آہستہ۔پورے کے پورے احکامات نہ فوری نافذ ہو سکتے ہیں نہ طالبان نافذ کر سکتے ہیں۔وہ بھی فی الحال اتنا کچھ کر سکتے ہیں جتنا ان کے بس میں ہے؟ تو پھر وہ ابتدا ان اقدامات سے کیوں نہیں کرتے جن سے لوگوں کی دلجوئی ہو، تسلی و تشفی ہو۔مغربیت زدہ اور گناہوں کے دلدادہ، دین سے دور عوام دین کے قریب آئیں۔انہیں مسجد میں آنے سے مزا آئے۔مولوی صاحب کے قریب بیٹھنے سے سکون ملے۔کندھے پر بوری اُٹھا کر اور غلام کو اونٹ پر سوار کر کے خود پیدل چلنے والا عمر (رضی اللہ عنہ وارضاہ) کہاں ہے؟ اس کا طرزِ حکومت زندہ کرنا چاہیے۔اس کے کوڑے سے ڈرنے والے اس کی شہادت پر دھاڑیں مار مار کے کیوں رو رہے تھے؟ خلاصہ یہ کہ ہمیں لباس، حلیہ، کلچرل ایشوز اور سزاؤں میں شرعی احکامات کی ''تنفیذ'' (فوری نفاذ) کے بجائے ''تدریج'' سے کام لینا چاہیے اور شریعت مبارکہ کے دوسرے حصے جس سے عوام کو خوشحالی،

روزگار، امن وسکون، اطمینان اور شریعت سے محبت نصیب ہوتی ہے، انہیں ''تدریج'' کے بجائے ''تنفیذ'' کے دائرے میں لانا چاہیے اور وقت ضائع کیے بغیر فوراً لے آنا چاہیے۔فرق صرف پہلے اور بعد کا ہے۔دیر صرف اتنی ہوگی جتنی ابتدا سے انتہا تک ہوتی ہے۔

فوری توجہ کن چیزوں پر ہو؟

یہ مشورہ ''تعطیلِ احکام'' نہیں ''تدریجِ احکام'' کا ہے۔یہ نہیں کہا جارہا کہ آدھی شریعت کو فی الحال چھوڑ دیا جائے۔نہیں! ہرگز نہیں! ہم تو شریعت کے ایک حکم سے......ادنیٰ حکم سے بھی دستبردار نہیں ہوسکتے۔اس کے بغیر ایمان ہی کہاں ہے؟ ہم تو یہ کہہ رہے ہیں کہ پورے کے پورے احکامات پر تو آپ بھی فی الحال آج ہی کے دن سے عمل نہیں کر پارہے۔سو فیصد کا دعویٰ تو آپ کا بھی نہیں ہے۔معروضی حالات ہی کچھ ایسے ہیں۔تو جب سارے احکام فی الفور نافذ نہیں ہوسکتے تو ہم ابتدا کچھ متفق علیہ چیزوں سے، کچھ تالیف قلب والی چیزوں سے، جن سے عوام کو بھی ریلیف ملے اور مخالفین کا منہ بھی نہ کھلے، کیوں نہ کریں۔کاش! ہم اپنی بات سمجھا سکتے کہ یہ نفاق یا مداہنت کی تلقین نہیں، تدریج وتنفیذ کے دائرۂ کار میں تقدیم وتاخیر کا مشورہ ہے۔آپ اخلاق، رویہ اور نظام ایسا رکھیں کہ لوگ گرویدہ ہوکر خود ہی آپ کا حلیہ اور آپ کا لباس آپ کو آئیڈیل سمجھ کر اپنالیں۔اس وقت سے پہلے آپ ان چیزوں کے بجائے ان چیزوں پر سختی کریں جو فوری توجہ کی محتاج ہیں۔مثلاً: عدالتوں کی بے انصافی، سرکاری عملے کی لاپرواہی، سرکاری ملازمین کی بددیانتی اور رشوت ستانی، وڈیروں اور جاگیرداروں کی طرف سے عوام کا استحصال، عوامی سہولتوں (بجلی، پانی، گیس، ٹیلی فون، صحت وصفائی، تعلیم وتفریح) کی ناقص فراہمی......وغیرہ وغیرہ۔اللہ کرے یہ بات سمجھ میں آجائے کہ فرق صرف پہلے اور بعد کا ہے۔اخلاقی مہارتوں کے استعمال اور منتظمانہ سختی کے اظہار کا ہے۔کامیابی کے کم اور زیادہ امکان کا ہے۔

آخری بات:

اسی بات کو ہم دوسرے انداز میں بھی کہہ سکتے ہیں۔یعنی چلیں اس بحث کو چھوڑ دیجیے کہ کچھ

احکام میں تنفیذ (فوری نفاذ) اور کچھ میں تدریج (آہستہ آہستہ عمل) ہونی چاہیے۔نہیں! تمام احکام فی الفور نافذ ہونے چاہییں۔وہ بھی جن میں ریاست کا سربراہ خادم اور اور عوام مخدوم ہوتے ہیں اور وہ بھی جن میں مقتدر شخصیات نگران وناظم ہوتی ہیں اور نظم کی خلاف ورزی کرنے پر موقع پر سزائیں جاری کرتے ہیں۔دونوں قسم کے احکام......فلاحی بھی اور نظامی بھی......فی الفور نافذ ہونے چاہییں۔کسی میں بھی تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔عوام کو جب تمام سہولتیں گھر کے دروازے پر ملیں گی، جب انہیں روٹی، کپڑا اور مکان سستا، بروقت اور عزت نفس کے احساس کے ساتھ ملے گا تو ان کو ہماری سختی بھی اچھی اور ہماری سزا بھی میٹھی لگے گی۔ہمیں خلافت راشدہ والا مکمل نظام جاری کرنا چاہیے جس میں دور دراز واقع سڑک پر چلتے ہوئے باربرداری کے جانور کو ٹھوکر لگ جاتی ہے تو خلیفۃ المسلمین اس کا ذمہ دار بھی خود کو سمجھتا ہے۔''اَلسُّلْطَانُ وَلِیُّ مَنْ لَّا وَلِیَّ لَہٗ'' (مسلمانوں کا امیر ہر اس شخص کا کفیل وسرپرست ہے جس کا کوئی خیال رکھنے والا نہ ہو) کے قانون کے تحت اسلامی ریاست کا سربراہ ہر اس شہری کی تمام بنیادی ضروریات کا کفیل ہوتا ہے جو اپنی ضروریات خود پوری نہ کرسکے۔امیر میں ذمہ داری اور جوابداری کا یہ احساس وہ چیز ہے جو عوام الناس کو اس پر فریفتہ کردیتا ہے، اس کا گرویدہ بناتا ہے۔وہ اس کے ساتھ جینے مرنے پر تیار ہوجاتے ہیں۔ہمیں ایسا فلاحی نظام عوام کو فراہم کرنا چاہیے جو ان کی محرومیوں کی تلافی کرسکے۔جو ان کے رستے زخموں پر مرہم رکھ سکے۔جو ان کی ناآسودہ جائز تمنائیں پوری کرسکے۔یہ تب ہی ہوسکتا ہے جب ہم عوام کی خدمت میں جت جائیں۔ریاستی وسائل کو عوامی سہولیات پر زیادہ سے زیادہ خرچ کریں۔ہر اس شخص کی ضرورت کو اپنی ضرورت سمجھ کر پوری کریں جو اپنے وسائل سے اپنی ضروریات پوری نہیں کرسکتا۔تب ہی سسکتی ترستی دنیا اسلام کی طرف واپس آئے گی۔وہ اسلام کے دامن میں عافیت اور تحفظ محسوس کرے گی۔اسے اسلام منوانا نہیں پڑے گا وہ خود اسلام مانگے گی۔اللہ تعالیٰ ہماری ان اُمیدوں کو پورا کردے۔

وما التوفيق إلا باللّٰہ العلی العظیم.

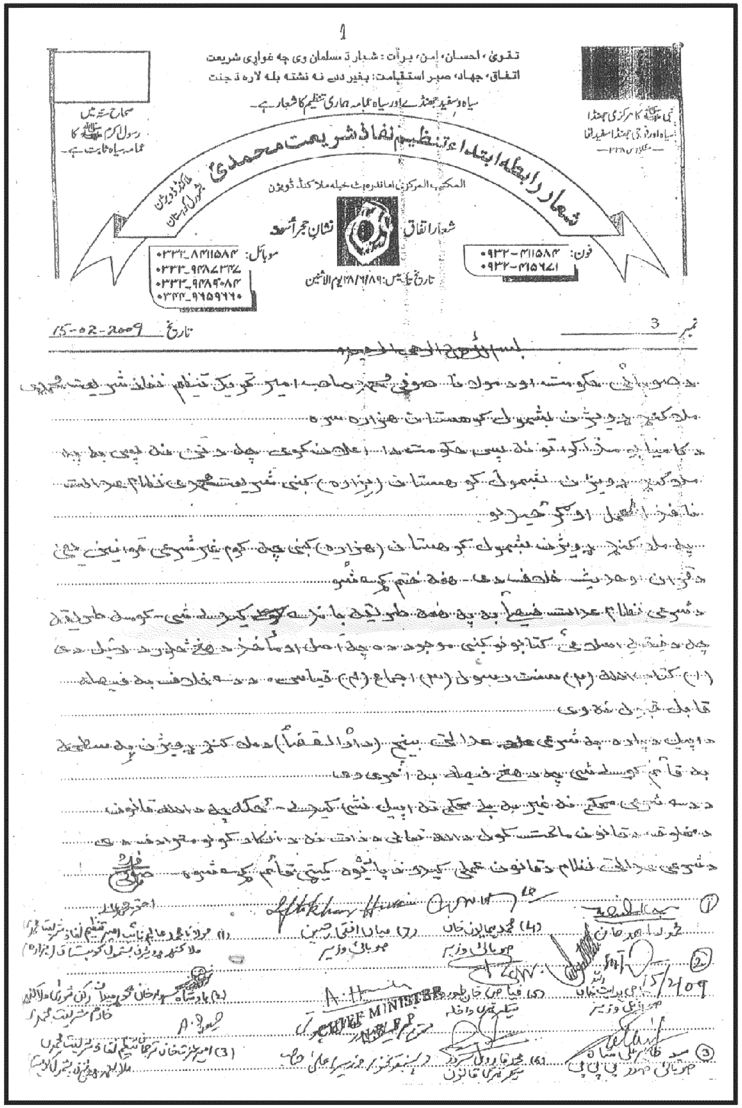
تقوی، احسان، امن، برأت: شبارة سلمان وی چه غواړی شریعت
اتفاق، جهاد، صبر استقامت: بغیر دے نه نشته بله لاره د جنت
سیاہ و سفید جھنڈے اور سیاہ عمامہ ہماری تنظیم کا شعار ہے۔
شعار و رابطہ ابتداء تنظیم نفاذ شریعت محمدی
المکتب المرکزی امانداره ڈویژن
شعار اتفاق — نشان حجر اسود
فون: ۰۹۳۲-۳۱۱۵۸۴ / ۰۹۳۲-۳۱۵۶۷۱
موبائل: ۰۳۳۳-۹۳۸۲۳۳۷ / ۰۳۳۳-۹۳۸۹۰۸۳ / ۰۳۴۴-۹۶۵۹۶۶۰
تاریخ تاسیس: ۲۸/۶/۸۹ یوم الاثنین

نمبر 3
تاریخ 15-02-2009

بسم اللہ الرحمن الرحیم

د صوبائی حکومت او د مولانا صوفی محمد صاحب امیر تحریک تنظیم نفاذ شریعت محمدی
ملاکنډ ډویژن بشمول کوهستان هزاره سره
د کامیاب مذاکراتو نه پس حکومت اعلان کوی چه د نن نه پس به په
ملاکنډ ډویژن بشمول کوهستان (هزاره) کښې شریعت محمدی نظام عدل
نافذ العمل اوګرځیدو
په ملاکنډ ډویژن بشمول کوهستان (هزاره) کښې چه کوم غیر شرعی قوانین چې
د قرآن و حدیث خلاف دی۔ هغه ختم کړے شو
د شرعی نظام عدالت فیصلے به په هغه طریقو باندے کیږی ...
چه د فقه اسلامی کتابونو کښې موجود دے چه اصل ماخذ د هغې څلور دی
(۱) کتاب اللہ (۲) سنت رسول (۳) اجماع (۴) قیاس ... د دے خلاف به فیصله
قابل قبول نه وی
د اپیل د پاره به شرعی عدالتی بینچ (دارالقضاء) د ملاکنډ ډویژن په سطحه
به قائم کړے شی چه د هغې فیصله به آخری وی
د دے شرعی محکمے نه غیر به بل محکمے ته اپیل نشی کیدے۔ ځکه چه د اللہ قانون
د مخلوق د قانون نه ماتحت کول د اللہ تعالی د ذات نه د انکار کولو مترادف دے
د شرعی عدالتی نظام د قانون عملی کیدو د پاره کمیټی قائم کړے شوه

(۱) مولانا محمد عالم نائب امیر تنظیم نفاذ شریعت محمدی ملاکنډ ډویژن بشمول کوهستان (ہزارہ)
(۲) میاں افتخار حسین — صوبائی وزیر
(۴) محمد ہمایون خان — صوبائی وزیر
Iftikhar Hussain
A. Haider Khan Hoti
CHIEF MINISTER NWFP
(۳) امیر عزت خان ترجمان تنظیم نفاذ شریعت محمدی ملاکنډ ډویژن بشمول کوهستان
(۵) بادشاہ صالح خان
15/2/09

صوبائی حکومت اورتحریکِ نفاذِ شریعتِ محمدی کا معاہدہ

صوبائی حکومت اور تحریک نفاذ شریعت محمدی (مالاکنڈ ڈویژن بشمول کوہستان ہزارہ) کے امیر مولانا صوفی محمد کے کامیاب مذاکرات کے بعد حکومت اعلان کرتی ہے کہ آج کے بعد مالاکنڈ ڈویژن بشمول کوہستان ہزارہ میں شرعی نظام عدل نافذ العمل ہوگیا ہے۔

مالاکنڈ ڈویژن بشمول کوہستان ہزارہ میں جو غیر شرعی قوانین...... یعنی قرآن اور حدیث کے خلاف...... ہیں، انہیں ختم کردیا گیا ہے۔

''شرعی نظام عدالت'' میں فیصلے ان طریقوں کے مطابق کیے جائیں گے جو فقۂ اسلامی کی کتابوں میں موجود ہیں جن کا اصل مآخذ چار چیزیں ہیں: (1) کتاب اللہ۔(2) سنت رسول۔(3) اجماع۔(4) قیاس۔اس کے خلاف کوئی فیصلہ قابل قبول نہیں ہوگا۔

اپیل کے لیے شرعی عدالتی بینچ (دارالقضاء) مالاکنڈ ڈویژن کی سطح پر قائم ہوگا جس کا فیصلہ حتمی ہوگا۔

اس شرعی محکمے (دارالقضا) کے فیصلے کے خلاف اپیل نہیں دائر کی جاسکے گی۔ کیونکہ خالق کے قوانین کو مخلوق کے ضابطوں کے ماتحت کرنا اللہ تعالیٰ کی ذات کے انکار کے مترادف ہے۔

شرعی عدالتی نظام کے عملی قیام کے لیے ایک کمیٹی بھی قائم کردی گئی ہے۔

مصنف کی دیگر کتب

تحقیقات و تالیفات	کالم اور مضامین	زیر طبع
شرح عقود رسم المفتی	بولتے نقشے	فہم الحدیث (تلخیص و تسہیل) معارف الحدیث
آداب فتویٰ نویسی	حرمین کی پکار	آپ ہدایہ کیسے پڑھیں؟
تسہیل السراجی	اقصیٰ کے آنسو	کتاب الجغرافیہ
الاملاء والترقیم	ہسپانیہ سے امریکا تک	جغرافیہ قرآنی
تحریر کیسے سیکھیں؟	عالمی یہودی تنظیمیں	چاند کے تعاقب میں
رہنمائے خطابت	عظمتوں کی کہانی	عالمی دجالی ریاست
اسلام اور تربیت اولاد (تلخیص و تسہیل)	امت مسلمہ کے نام	اسرائیل کی کہانی
خواتین کا دینی معلم	سرچنگ پوائنٹ	
دجال: کون، کب، کہاں؟	بسنت کیا ہے؟	
فارسی کا آسان قاعدہ	عالم اسلام پر امریکی یلغار کیوں؟ (ترجمہ و تعارف)	
گناہ معاف کرانے والی نیکیاں		

برائے رابطہ

0313-9264214
0321-2050003